ارام سے حکومت کے مزے اُڑاتے۔ یوسف زئی قبیلہ عرصہ دراز سے انتہائی دلیر نڈر اور جنگجو قبیلہ ہونے کیساتھ ساتھ ایک نامی گرامی قبیلہ چلا آرہا تھا۔ اور دوسرے پشتون قبائل اُنکی اس حیثیت سے ہمیشہ بغض رکھتے تھے۔ اور اسکی قوت بازو کو توڑنا چاہتے تھے۔ جس کے لئے بہت سے قبائل ملکر اکبر اعظم کے دربار میں شکایت کی۔ نتیجے میں اُس نے خوشحال خان کے خاندان کو اٹک کے راستے محصول کی حصولی کی ڈیوٹی سونپی اور اسکی عوض انہیں سرداری اور جاگیرداری سے نوازا گیا اور یوسف زئی سے خٹک کی باقاعدہ دشمنی اور رسہ کشی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا جس میں خوشحال خان خاندان کے سرکردہ افراد یوسف زئی کے ہاتھوں قتل کردیئے گئے اور یوسف زئی کے چوٹی کے افراد بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ دشمنی شاہ جہان کے دور میں خوشحال خان کی میراث ٹھرگئی خوشحال خان نے حق نمک ادا کرتے ہوئے یوسف زئی کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اور ہروقت مغل حکمران کے کان بھر لیے اسلئے تو اُسے مغل حکمران شاہ جہان کی طرف سے یوسف زئی کے بعض علاقوں کی جاگیریں دیدی گئی۔ لیکن یوسف زئی قبیلہ میں بھی ایسے زیرک اور دانشور موجود تھے جو تلوار کی دھنی اور میدان جنگ میں لڑنے کی گر کے ماہرین ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست و امارت کے بہترین صفات سے بھی متصف تھے۔

تاہم وہ مناسب موقع کے انتظار میں ضرور رہتے اور بے جا اپنے بھائیوں اور جوانوں کے خون بہانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ایک ایسے سازگار میدان کے تلاش میں تھے۔ جہاں وہ اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کریں اور ایسی طرح مغل حکمران پر اپنا رُعب جما کر خوشحال خان کے مکارانہ رویے اور بے جا خوشامدی اور مغل دربار میں یوسف زئی کے خلاف دروغ گوئی اور الزامات کا بھانڈا پھوٹ جائے اور اصل حقیقت سامنے آجائے۔

جب اخوند سالاک نے اخون پنجو کے ایماء اور حکم پر جہادی قافلہ کی تشکیل دی تو مامون کا بیٹا اور قائد یوسف زئی بہاکو خان نے آپکی آواز پر لبیک کہا۔ اور چملہ کے میدان میں اپنے لاؤ لشکر سمیت نمودار ہونے لگے اور ڈوما کفار کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئی۔ بہاکو خان کے اس جہادی قافلے میں شامل ہونے کے بارے میں ''دہند پہ گورگانی امپراتورئی کے دپشتو ونڈہ'' نامی

کتاب میں مصنف صفحہ 154 پر لکھتے ہیں۔

ترجمہ: جب خوشحال خان کو مغل حکمران کی طرف سے بعض علاقوں کی جاگیریں دے دی گئیں تو بہاکو خان نے ارادہ کیا کہ اخون سالاک کا ساتھ دیں اخوند سالاک نے بعض پشتونوں کے ساتھ ملی اور اسلامی لشکر بنایا تھا۔ بہاکو خان اس اسلامی لشکر میں شامل ہوجائے اور مغل حکمرانوں پر آپنے آپکو منوائے۔

دوسری جانب ''تاجک سواتی ومملکت گبر تاریخ کے آئینہ میں'' پروفیسر محمد اختر ڈوما پر لشکر کشی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں'' اس دور میں یوسف زئیوں کے حالات خراب ہونے لگے تھے اور اخون پنجو نے یوسف زئیوں کی مدد کے لئے اخون سالاک کو بہاکو خان خدوخیل کی مدد پر مامور کیا جو ڈوما کفار (تاتاری النسل کفار) کے علاقوں پر قبضہ کا خواہشمند تھا تاکہ دریائے سندھ کے کنارے کوہستان سوات اور کوہستان ہزارہ سے کفار کو نکال کر یوسف زئی قبائل اس علاقے میں بسائے جائیں ساتھ ہی ساتھ قبیلہ سواتی کے لوگ جو اُس وقت چکیسر اور غوربند کے پہاڑی علاقوں میں رہتے تھے۔ اُنکا انخلاء بھی مطلوب تھا۔ ڈوما کفار دریائے سندھ کے دونوں کناروں کے پہاڑی علاقوں پر صدیوں سے بااختیار آزاد حکمران چلے آرہے تھے''۔

درجہ بالا اقتباس کے شروع میں اخون پنجو اور بہاکو خان بابا نے حمایت کی حامی بھرلی ہے تو یہاں اُنکے پیش نظر اپنی خاندان کا ساتھ عزیز تھا اگر بہاکو خان نے اسکی مدد چاہی ہے۔ تو اسمیں بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ اور مغل حکمران پر اپنا قبیلوی ساکھ بٹھانے کا مقصد پنہاں نظر آتا ہے۔ لیکن اقتباس کے آخری حصہ میں اخون پنجو بابا کی مقصد کو پھر مشکوک بنایا گیا ہے۔ کیونکہ وہ چکیسر اور غوری کے علاقوں سے اپنے ہم نسب والوں کے انخلاء کے حق میں کیسے ہوسکتا ہے۔ البتہ ایک بات واضح ہے۔ ہوسکتا ہے۔ اخون پنجو بابا کی اپنے اُن ہم نسب سواتیوں جو چکیسر اور غوربند میں مقیم تھے کے ساتھ خاندانی کشیدگی تھی۔ اور آپ انہیں کے ہاتھوں پشاور منتقل ہوچکے تھے اور اب کے بار اس نے موقع کو غنیمت جان کر بہاکو خان کے مدد کیلئے اپنا لشکر بھیجا تھا۔ حقائق جو بھی ہو البتہ یہ بات طے ہے کہ اس جنگ میں اخوند سالاک، بہاکو خان تولیوں اور سواتیوں کی اخلاص اور بہادرانہ جہادی

سرگرمیوں اور ملی غیرت پر کسی بھی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہیں۔

اخوند سالاک اخوند پنجو بابا کی ایماء پر ڈوما کفار کے علاقے پر حملے کا پروگرام بنایا۔ اور اس مقصد کے لئے موضع کابل گرام کو مرکز بنا کر سکونت اختیار کی۔ ابتداء میں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اُن کو تنولیوں، سواتیوں اور یوسف زئیوں کا کثیر لشکر دستیاب ہو گیا۔ سب سے پہلے تنولیوں نے 1644ء کے لگ بھگ اخوند سالاک سے دُعا کر کے حملہ کیا اور چار ہزار کی جمعیت سے ڈوما کے بارہ ہزار لشکر کو شکست دے کر موجودہ علاقہ تناول پر قبضہ کر لیا۔ لاشیں گرتی رہی۔ تلواریں چلتی رہی، نیزے ٹوٹتے گئے کفار کے سینے چھلنی ہوتے گئے اور اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہو رہی تھی۔ کہ اس اثناء میں جنگ کا کایا پلٹ گیا پکھلی کے مسلمان ترکوں نے خونی رشتے کو مقدم سمجھ کر مذہبی رشتے کو پس پشت ڈالا اور ڈوما کفار کی مدد کی۔ اس صورت حال کے پیش نظر اخون سالاک نے اپنے جنگی ایجنڈا میں تبدیلی لائی اور ترکوں کی پیش بندی کے غرض سے ڈوما کے مشرقی علاقے پر مزید کاروائی سے قبل سواتیوں اور یوسف زئیوں کے مشترکہ لشکر نے پانچ ہزار کی جمعیت سے خود لشکر کی قیادت کرتے ہوئے قلعہ چھانجل نزد تھاکوٹ پر حملہ کر دیا۔ شمالی علاقہ میں یہ ترکوں کا مضبوط قلعہ تھا۔ جس سے پکھل سرکار کا شمالی علاقہ کنٹرول کیا جاتا تھا۔ قلعہ فتح ہوا اور شمشیر خان ترک جو سلطان شادمان خان پکھل کا گماشتہ اور قلعہ دار تھا۔ کو شکست دیکر قلعہ مسمار کیا۔ اور پکھل کے تمام شمالی علاقے پر قبیلہ سواتی کا قبضہ ہو گیا جو سوات کے پہاڑی دروں سے منتقل ہو کر بمعہ اہل و عیال اُس مفتوحہ علاقے میں آ کر آباد ہو گئے۔ چھانجل کے فتح کے بعد یوسف زئی کی کاروائیاں اخوند سالاک کی قیادت میں کالاڈھاکہ (تورغر) کے مغربی حصہ اور مہابن کے دامن میں علاقہ مداخیل اور امازی میں شروع ہو گئیں اور تھوڑی ہی عرصہ میں مہابن اور کالاڈھاکہ کا علاقہ یوسف زئیوں کے زیر تصرف آ گیا۔

ڈوما کا علاقہ پہاڑوں کی تکیل چوٹیوں اور جان گسل پہاڑی دروں پر مشتمل ہونے کی سبب اسکی تسخیر میں مجاہدین و بہت مشکلات کا قدم بہ قدم سامنا کرنا پڑا۔ یوسف اور مندڑ قبائل نے اس جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہر قبیلے کا لشکر اپنے اپنے سردار کی کمان میں اس جہاد میں اگے

بڑھے خصوصاً بہا کو خان نے بہادری کی ایک ایسی باب رقم کی جو رہتی دنیا تک یاد رکھی جائے گی۔ کفار کا لشکر اپنے سردار حاکم ڈوما کے زیر کمان ڈوما کے قلعہ میں مقیم تھا۔ قلعہ کی تسخیر نا قابل یقین لگ رہی تھی جب گھمسان کی رن پڑی اور فریقین میں بدست لڑائی شروع ہوئی تو عیسی زئی کے قبیلہ حسن زئی کی شاخ کوٹوالی کی ایک جانباز کے تیر سے ڈوما ہلاک ہو گیا راجا کے مرتے ہی کفار کی لشکر سے ہوا نکل گئی اور مسلمان لشکر پر کوہستان میں فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ بہت سارا مال غنیمت اور جنگی قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے قیدیوں میں ڈوما کی شنڈی نامی حسین و جمیل رانی بھی تھی جسے اخوند سالاک نے بہا کو خان کی عقد میں دے دی بتایا جاتا ہے کہ پنجتار، چملہ، مخرنئی اور خانانوں ڈیرئی کے خوانین جو ماضی میں ایک ہی جد امجد کے چشم چراغ اور جگر گوشے ہیں۔ کے موجودہ خوانین اُسی رانی کے بطن سے ہیں۔ ڈوما کے ہلاکت کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے۔ کہ وہ بہا کو خان کے تیر کے زد میں آ کر ہلاک ہو گیا تھا۔ جو کہ پہلے روایت کے مقابلے میں زیادہ وزنی معلوم ہوتا ہے۔

اس جنگ میں اخوند سالاک کی قیادت میں تنولیوں، سواتیوں اور یوسف زئیوں کی لشکر نے کفار کے خلاف خوب ڈھٹائی دکھائی اور بونیر تا تناول سارے پہاڑ اور میدان یکے بعد دیگرے اُنکے قبضے میں آئے اور ان مفتوحہ علاقوں پر ڈوما کو شکست دینے کے بعد آباد ہونے لگے۔ اس علاقہ ڈوما کو تقسیم کرنے کے لئے یوسف زئی کا گرینڈ جرگہ بُلایا گیا۔

جنوب مشرق کا علاقہ خدوخیل کو ملا ڈوما کا مشرقی علاقہ حسن زئی کے حصے میں آیا۔ جنکی سرحدیں تناول (ہزارہ) سے جا ملتی ہیں شمالی حصہ میں مکی خیل اور نصرت خیل اور جنوب اور مغربی حصہ میں سندر خیل کو آباد کئے گئے اس سے پہلے یہ لوگ علاقہ بونیر کے دوسرے حصوں میں مقیم کھائی دیتے ہیں مہابن کے شمال کی طرف کا علاقہ امان زئی (مندڑ) کو ملا جو چملہ سے نقل مکانی کرتے ہوئے اس طرف کوچ کر آئے تھے۔ اس طرح اخوند درو ہزہ بابا کی اولاد جو اسماعیل زئی چغرزئی کے ساتھ اُس وقت شل بانڈئی، باجکٹہ وغیرہ میں آباد تھے اور انہیں چغرزئی اسماعیل خیل میں افراد کے حساب سے زمین دی گئی تھی۔ اُنہیں بھی یہاں لا کر چغرزئی قبیلہ کے ساتھ موجودہ علاقہ چغرزئی میں بسائے گئے اور یہاں انہیں افراد کے حساب سے زمین دی گئی جو کہ آجکل انجر میرہ میں آباد ہیں اور انجر میرہ

کا میدان پہاڑ اور شاملات اُنکی جائیداد میں شامل ہیں۔

اسکا ذکر تفصیلاً اخوند درو ہزہ بابا کے باب میں آئے گی انشاءاللہ

یوسف زئی کا یہ عظیم الشان جلسہ جو مفتوحہ علاقوں کی تقسیم کے لئے بُلایا گیا تھا۔ اسی ہی جرگہ میں قائد بہا کو خان کو سارے یوسف زئی نے متفقہ طور پر اپنا سردار مان لیا اُپکی سر پر سرداری کی پگڑی باندھ لی گئی۔ اور وہ نہ صرف تمام تُخی قبائل کا بلکہ سارے سوات، باجوڑ سوات تا دوآبہ اشنغر اور چھچھ ہزارے تک کا قائد تسلیم کیا گیا اس کے بعد بہا کو خان نے عہد شاہ جہان میں دربار دہلی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ شاہ جہان کا بیٹا اور معاون اپنے پالیسی میں تبدیلی کا خواہشمند تھا۔ وہ دربار میں خوشحال خان کے ہر وقت یوسف زئی کی خلاف بیان بازیوں اور فتوؤں سے تنگ آچکا تھا۔ کیونکہ وہ اسی طرح مغل دربار کو لوٹتے مراعات وصول کرتے، اپنا قد بڑھاتا اور جاگیریں جمع کرتا تھا۔ اس لئے داراشکوہ نے بہا کو خان کو دہلی دربار میں دعوت دی جسے آپ نے قبول کر کے دربار دہلی میں حاضر ہوئے دربار میں بہا کو خان کا شاندار استقبال کیا گیا داراشکوہ نے آپکو بہت عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا اور آپ کی خاطر تواضع کا بہت خیال رکھا۔ اور یوسف زئی کے وہ علاقے جو بہت پہلے خوشحال خان خٹک کو جاگیر میں ملے تھے۔ اُن سے واپس کر کے باضابطہ طور پر بہا کو خان کے حوالے کیے اس سے مغل دربار میں خوشحال کی وہی حیثیت نہیں رہی۔ یوسف زئی اور خٹک کے درمیان مدتوں سے جاری دشمنی کو اب خشک ایندھن ہاتھ آگئی اور اسی طرح دونوں قبیلوں کے درمیان محاذ ایک مرتبہ پھر گرم ہوتا گیا۔ خوشحال خان خاندان کے ساتھ یوسف زئی کی جنگوں کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ بہا کو خان کے دور اقتدار میں ساری قوم ایک ہی جھنڈے تلے جمع تھی اور ایک ہی آواز ایک اتحاد اور ایک اتفاق کی مظہر تھی لیکن اسکے وفات کے بعد پشتون قوم اور خصوصاً یوسف زئی انفرادیت کا شکار ہوکر مرکزیت نے دم توڑ دی اور ہر علاقے پر ایک سردار اور خان آژدھا بن کر اپنی حکمرانی اور خود مختاری کا بھرم مچانے لگا۔ اور یوں قبیلوی خاندانی اور دیہاتی جھگڑے اور محاذ آرائیاں سر اُٹھانے لگے۔ اور باقاعدہ طور پر دورِ ظلمت کا آغاز ہونے لگا۔ جسے پشتون اصطلاح میں ''پشتو دور'' کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے ساری قوم ایک ہی نقارے پر جمع ہوتی اور ایک ہی اعلان پر دشمن کے خلاف

میدان جنگ میں کودتے اور سرخرو ہوکر واپس لوٹتے اب کے بار ہر گاؤں اور ہر قبیلے میں کئی جنگی نشانات اور جنگی نعرے بلند ہوتے گئے اور پہلے جو وہ دشمن کے خلاف اُٹھ کر دشمن کو دندان شکن شکست پر مجبور کرتا۔ اب وہ اپنے بھائیوں اور اپنے جگر گوشوں کے گلے کاٹنے لگے۔ اُنہیں دیہات بدر اور علاقہ بدر کیا جانے لگا۔

قائد یوسف زئی بہا کو خان کے بعد کا ذکر کرتے ہوئے روشن خان اپنی کتاب ''یوسفزئی قوم کی سرگزشت'' کے صفحہ ۲۵۳ پر لکھتے ہیں ''کہا جاتا ہے کہ علاقہ یوسف زئی میں جب کہ ہمیشہ ایک منتخب سربراہ مملکت، حکومت کرتا رہا۔ بہا کو خان کے بعد خوانین کی تعداد ۳۲ تک پہنچ کر سبھوں نے اپنی اپنی ریاستیں بنائیں''۔

خیبر پختونخواہ میں سیکھ شاہی کا ظہور

سولہویں صدی عیسوی کی ابتدائی سالوں میں افغان مغل رسہ کشی نے جنم لیا افغانوں کے آپس میں ناچاقی اور بے اتفاقی نے مغلوں کو برصغیر کے سیاہ وسفید کے مالک بنا دیا۔ پھر بھی سلطنت مغلیہ کو افغانوں کے ہاتھوں ایک لمحہ کے لئے آرام کی نیند نصیب نہیں ہوسکی اور دونوں قوموں کی یہ چپقلش مغل زوال تک مسلسل جاری رہی۔

1738ء میں ایران کے نادرشاں نے کابل کے مغل گورنر کو شکست دیکر کابل پر قبضہ کرلیا لیکن صوبہ کابل واپس اُسے بطور جاگیر رکھنے کی اجازت دے دی۔ نادرشاہ کی وفات پر 1745ء میں احمد شاہ ابدالی قندہار کے تخت پر براجمان ہوئے اور سارے صوبہ پختونخواہ کا الحاق افغانستان سے کراکے کوزہ اور برہ پختونخواہ پر پشتونوں کی حکومت رہی۔ احمد شاہ ابدالی کی وفات پر آپکا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا لیکن اُسکے نااہلی کی سبب مرکزی حکومت کمزور پڑ گئی۔ مقامی سرداروں نے جگہ جگہ بغاوتیں کرکے آزادی اور خودمختاری کا اعلان کیا اور ملک چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گئی۔ ان حالات نے سیکھوں کیلئے راستہ ہموار کیا اور آخر کار 1818ء کو اُنہوں نے عملی طور پر پختونخواہ میں پنجے گاڑ دیئے۔

تحریک مجاہدین

برصغیر کی تاریخ میں تحریک مجاہدین بنیادی کردار کا حامل باب ہے۔ کیونکہ یہ برصغیر میں پہلا مشترکہ تحریک تھی۔ جسکی جڑیں دور دور تک پھیلتی گئیں جو اپنی نوعیت کی سب سے دراز عمر تحریک ثابت ہوئی اور آج تک کسی نہ کسی شکل میں دنیا کی طول وعرض میں سرگرم عمل ہے۔ اگرچہ یہ تحریک برصغیر کے جنوبی اور وسطی علاقوں سے اُٹھی لیکن اسکی بڑھوتری اور پھلنے پھولنے کیلئے خیبر پختونخواہ کے

میدان، دشت اور پہاڑی برف پوش چوٹیاں انتہائی زرخیز ثابت ہوئیں۔

یہ تحریک سیکھوں کے اُن مظالم اور ستم کے خلاف اُبھری جو اُنہوں نے وقتاً فوقتاً بے چارے مسلمانوں پر ڈھائی۔ اور اُن پر حلقہ حیات تنگ کرکے اُنہیں ہر حال میں زدوکوب کیا۔ ارباب بہرام خان کا تعلق تہکال سے تھا اور وہ یہاں سے ہجرت کرکے علاقہ رستم میں مقیم ہوئے تھے وہ سید احمد شہید کے مریدوں میں سے تھے۔ ہر سال اُن کے پاس بریلی جایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ارباب جب اپنے ساتھیوں سمیت گھوڑوں پر پنجاب سے گزر رہے تھے تو اُنھوں نے چند خواتین کو ایک رہٹ سے پانی بھرنے دیکھا چونکہ یہ لوگ پشتو میں باتیں کررہے تھے اس لئے وہ اُنکی طرف بڑھیں اور کہا کہ وہ مسلمان ہیں اور پختون ہیں۔ سکھوں نے ان سے جبری مذہب تبدیل کرواکر بطور لونڈی رکھا ہوا ہے۔ خدارا کسی طرح ہمیں اس ظلم سے نجات دلائیں، ارباب صاحب نے یہ ساری باتیں سید صاحب کے گوش گزار کیں اور ان سے استدعا کی کہ وہ سکھوں کیخلاف پختونوں کی مدد کیلئے پشاور آئیں (تحریر افتخار الدین روزنامہ آج 17 اگست 2011) اسی طرح ایک پختون مسلمان دوشیزہ کی عزت پر غیرت کھا کر اسکی دادرسی کیلئے شاہ صاحب وارد پختونخواہ ہوا لیکن افسوس کہ ان پشتونوں کے ہاتھوں اُسے یہاں سے مجبوراً کوچ کرنا پڑا البتہ ارباب بہرام خان نے مذہبی اور نسلی تقدس کی لاج اپناتے ہوئے آخری دم تک سید احمد صاحب کا ساتھ دیا اور بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہوئے اُن کو وہاں دفن کردیا گیا لیکن بعد میں اُسکے لاش کو لاکر تہکال میں اُنکے آبائی قبرستان میں دفن کردیا گیا۔ واضح رہے کہ اُنکے اولاد میں سابق آئی جی پولیس ارباب مختار احمد، میجر یوسف شہید سابق ٹیلفون جنرل میجر ارباب صفدر خان شامل ہیں۔ پچھلے دنوں اُس عظیم بطل حق اور پشتون شناس ہستی کے نام پر پشاور یونیورسٹی میں ایک ہاسٹل منسوب کیا ہے۔ یہ وہ دور تھا کہ مغل سلطنت کمزور پڑ چکی تھی اور مسلمانوں کی وسیع سلطنت ٹکڑوں میں بٹ کر چاروں طرف مسلمان خانہ جنگی اور بغاوتوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اُودھ میں شجاع الدولہ، دکن میں نظام اور بنگال، اڑیسہ اور بہار میں علی وردی خان اپنی اپنی خودمختاری کے گن گا رہے تھے۔ اِس اثناء میں کہ مسلمہ دنیا عجیب اضطراب میں مبتلا تھی اور مسلمانوں کا بُرا حال تھا۔ سید صاحب نے کمر ہمت باندھ کر تلوار بے

نیام کردیا۔ اور میدان جہاد کا قصد کرنے گئے۔ 1786ء میں بریلی میں ایک دینی گھرانے میں آنکھیں کھولنے والے اِس ہستی نے مجاہدانہ ذوق اور جہادی جذبہ روز ازل سے لایا تھا۔ اور اِسی جذبے نے بڑے ہوکر اُسے والئی ٹونک (راجپوتانہ) امیر محمد خان کے فوج میں بھرتی کرنے کیلئے بے قرار کیا۔ والئی ٹونک کی فوج میں بھرتی ہوکر جے پور اور مادھوراج کی جنگوں میں اپنا ہوہا منوایا اور جب والئی ٹونک نے انگریز سے صلح کرلی تو سید صاحب نے دِل برداشتہ ہوکر ملازمت چھوڑ دی اور واپس وطن لوٹے البتہ جہادی جذبہ ٹھنڈا ہونے کی بجائے روز افزوں ترقی کرتا گیا۔ 1821ء میں اُسے حجاز کے سفر کی سعادت نصیب ہوئی اور تقریباً تین سال مقامات مقدسہ میں گزارنے اور مسلمانوں کی روحانی تطہیر کرنے کے بعد وطن واپس آکر عملی جہاد کے میدان کی فکر میں لگ گئے۔ اور آخر اپنے چھوٹے جہادی قافلے کو ساتھ لیکر 1826ء کو سفر پر روانہ ہوئے افغانستان جاکر سرداران پشاور کو سکھوں کے خلاف جہاد کی ترغیب دی۔ لیکن سید صاحب کی باتوں کا اُن پر کچھ آثر نہ ہوا۔ وہاں سے پشاور آئے یہاں ہشتنگری اور چارسدہ کے لوگوں نے آپکا اور آپکے ساتھیوں کا شاندار استقبال کیا۔ نوشہرہ میں سید احمد صاحب نے پڑاؤ ڈالا اور مختلف علاقوں سے لوگ جوق در جوق آکر سید صاحب کے ہاتھ پر بیت جہاد کرنے لگے۔ یہ حالات دیکھی تو سکھ فوج نے بدھ سنگھ کے کمان میں سات ہزار کا لشکر تیار کرکے حملہ کی تیاری کی۔ مجاہدین نے پہل کرکے رات کی تاریکی میں سکھوں کے لشکر پر اکوڑہ خٹک کے قریب جھپٹ پڑے اور سکھوں کے سات سو لشکر کو موت کے گھاٹ اُتار کر پہلی کامیابی حاصل کی۔ اسکے بعد سید صاحب نے ہنڈ کے خادی خان کے اصرار پر اپنا مرکز ہنڈ مقرر کیا جو دفاعی لحاظ سے کافی محفوظ اور مضبوط مقام تھا۔ سکھوں کے ساتھ دوسری لڑائی حضرو کے مقام پر لڑی گئی جسمیں سکھ جرنیل بدھ سنگھ اور اسکے فوج کے اوسان خطا ہوکر میدان سے بھاگ نکلے اور مسلمانوں کو دوسری بار شاندار فتح نصیب ہوئی۔ تحریک کی روز افزوں ترقی اور کامیابی مسلسل سکھوں کیلئے دردسر بنتی جارہی تھی۔ کیونکہ پختونخواہ کے نامور روساء خوانین اور بزرگ سید صاحب کے گرد جمع ہورہے تھے۔ اور آپکے ہاتھ پر بعیت جہاد میں سبقت سعادت اور سُرخروئی سمجھ رہے تھے۔ سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کرنے والوں میں خادی خان رئیس ہنڈ، اشرف خان رئیس

زیدہ، فتح خان رئیس خدوخیل پنجتار، مرد مجاہد سید اکبر شاہ، فیض اللہ ہزارخوانی اور اخون آف سوات میاں گل عبدالغفور کے نام قابل ذکر ہیں۔ سرداران پشاور کا اگرچہ اِس تحریک سے کوئی دِلی لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن تحریک کی اِس بڑھتی ہوئی رفتار کو دیکھ کر بادل ناخواستہ اِس جہادی قافلے میں شمولیت کا اعلان کرگیا۔

حضرو اور آٹک دونوں مقامات پر مسلسل کامیابی کے پیش نظر اِس بار سکھوں نے ایک فیصلہ کُن جنگ لڑنے کا تہیہ کیا اور اسکی کامیابی کی تصویر کا اُنہوں نے پہلے سے نظارہ کرکے مطمین دِل میدان جنگ میں اُترے کیونکہ اُنہوں نے جنگ سے پہلے سرداران پشاور سے ساز باز کیا تھا اور اُنہیں مختلف لالچ اور رشوت دیکر اُنکے ضمیروں اور ایمانوں کا سودا کرلیا تھا۔ شیدو کے مقام پر جب یہ تاریخی جنگ شروع ہوئی تو عین لڑائی کے دوران ایک تو خفیہ طریقے سے سازش کے تحت یار محمد خان کی ایماء پر سید صاحب کو شام کے کھانے میں زہر دیا گیا۔ جس سے وہ اتنے بے مجال اور نڈھال ہوئے کہ گھوڑے کے پیٹھ پر سوار ہونے کے قابل نہیں رہے۔ لیکن مجاہدین کا حوصلہ قائم رکھنے کے خاطر اُسے میدان جہاد میں لایا گیا جنگ شروع ہوگئی سکھوں کی لاشیں گرتے رہے اور مجاہدین کی فتح یقینی ہوچکی تھی۔ کہ اِس اثناء میں عظیم خان ایک تو اپنے جگہ سے ٹس سے مس نہیں رہے اور پھر شکست شکست کا مجنونانہ نعرہ لگا کر خود بھی میدان سے بھاگ نکلے اور مجاہدین کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اِس جنگ میں بونیر کے سالارزئی، عائشہ زئی اور اسماعیل زئی، سوات کے اکوزئی اور بونیر کے اخون خیل بہت بے جگری سے لڑے اور ایک ایک کرکے جام شہادت نوش کرگئے روایت ہے کہ مذکورہ علاقوں میں شاید ایسا کوئی گھر ہوا ہوگا جس سے جنگ شیدو کے شہید کا جنازہ نہ نکلا ہو۔ علاقہ بونیر اور سوات کے باباؤں اور بزرگوں کے سینوں میں آج بھی اپنے آباواجداد کے جہادی کارناموں، قبائلی رزم وبزم اور خصوصاً جنگ امبیلہ اور جنگ شیدو کی رزمیہ اور جہادی داستان محفوظ چلے آرہے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ بعض نے تو اُنکے شجاعت کی یادگاریں تلواروں کی شکل میں محفوظ کی ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں مذکورہ علاقوں میں آج بھی اُن شہداء کی یادگاریں عظمت رفتہ کو تازہ کرتی ہیں اس جنگ میں رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کی تربیت کے لئے فرانسیسی اور اطالوی تجربہ کار جنگ میں ماہر انسٹرکٹر بڑی بڑی

تنخواہیں دے کر ملازم رکھے ان کی زیرنگرانی توپ خانے تھے۔ نوشہرہ کی لڑائی میں فرانسیسی توپخانے نے بڑی تباہی مچائی، کابل ریور سٹیشن کے سامنے ایک وسیع قبرستان ان شہداء کا ہے۔ جن میں خٹک اور یوسف رئی بڑی تعداد میں شہید ہوئے۔ اس جنگ کے بعد سید صاحب کو چنگلئی لایا گیا جہاں مجاہدین اور سید صاحب نے ایک ماہ کا عرصہ جس بے سروسانی اور کسمپرسی میں گزارا وہ ایک الگ داستان ہے۔ جب سنبھل گئے تو سوات اور بونیر کے طویل دورے پر روانہ ہوئے۔ تقریباً دو ماہ پر محیط اِس کامیاب دورے سے واپسی پر آپ نے اپنا مرکز چنگلئی سے پنجتار منتقل کیا۔ یہاں مسجد کی تعمیر کی۔ قاسم خیل کے مقام پر بارود کا کارخانہ لگایا اور جنگی تربیت حاصل کرنے کے لئے باقاعدہ میدان کا تعین کر کے نئے عزم اور نئے ولولے کے ساتھ ایک بار پھر جہادی مہم کا آغاز کرنے گئے۔ چونکہ بارک زئی سرداروں نے جنگ شیدو میں پوری کوشش کی تھی۔ کہ اِس عظیم تحریک کو منطقی انجام تک پہنچا کر حکومت اور امارت کے مزے لوٹائے لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا۔ اب کے بار بارک زئی سرداروں نے تحریک مجاہدین کے خلاف ہشتنگری میں ایک بڑے لشکر کو جمع کر کے محاذ کھول دیا۔ لیکن مجاہدین کے ہاتھوں بڑی ذک اُٹھائی۔ خادی خان آف ہنڈ اِن دنوں مجاہدین کے خلاف کمربستہ رہے۔ شاید اسلئے کہ سید صاحب کا اپنا مرکز ہنڈ سے پنجتار منتقلی کا فیصلہ اُس نے اپنے خانی اور غیرت کے لئے بہت بڑا چیلنج اور عزت پر حرف سمجھ کر ایسا کیا تھا۔ اور اِسی خودداری اور ہٹ دھرمی کے سبب مجاہدین کے خلاف جنگ میں اُسے آخر کار موت کا پیالہ پینا پڑا۔

سید صاحب کو اب چاروں طرف حالات نے جکڑ رکھا تھا اور آئے روز مجاہدین کو کسی نہ کسی نئے طوفان کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

جب زیدہ کے مقام پر یار محمد خان کے لشکر نے مجاہدین کے لشکر پر حملہ کیا تو اس میں یار محمد خان اپنے 300 ساتھیوں سمیت زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور یوں حالات نے ایک اور کروٹ بدلی۔ سید احمد شہید کا مقصد سکھوں کے قوت بازو کو توڑنا اور ایک اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ لیکن یہاں اُسے دُہرے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ سکھوں کا خاتمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے مقامی بغاوتوں کو کچلنے کا کڑوا گھونٹ بھی حلق سے اُتارنا پڑا کہ بعض امور میں تحریک کے بعض متوالوں کے

بعض اُمور میں عجلت، زبردستی اور ہٹ دھرمی نے معاملے کو سلجھانے کے بجائے اُلجھا دیا تھا۔ اور یہ کہ وہ زمینی حقائق، پشتون روایات اور مزاج کو بروقت اور صحیح طور پر سمجھنے میں ناکام رہے۔ جس سے مقامی آبادی اور خوانین و اُمراء کے مابین بے چینی اور غیر یقینی صورت حال کی لہر دوڑ گئی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمیشہ ایسے حالات اور تبدیلی و انقلاب برگرز سفید پوش اور اشرافیہ طبقے اپنے اقتصادی، معاشرتی اور سماجی پوزیشن کے لئے بڑا خطرہ بھی تصور کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ بنیادی طور پر اُنکے پوزیشن کو مستحکم اور اُنکے اقتصادیات کے بہتری کے لئے مہمیز سے کم نہیں ہوتے۔

یہی وجہ تھی کہ تحریک مجاہدین کے خلاف مختلف محاذیں کھولنے لگے ایک طرف نواب احمد خان ہوتی نے مردان میں محاذ کھولا تو دوسری طرف بارکزئی سرداروں کے جوش انتقام بھڑک رہی تھی۔ مردان میں نواب احمد خان کے ساتھ مجاہدین کے جھڑپ کے بعد فریقین کے درمیان بمقام مایار 1830ء کو فیصلہ کن جنگ لڑی گئی جس میں 80 دُرانی جان بحق ہوئے اور مجاہدین کے 28 افراد شہید ہونے کے ساتھ ساتھ شاہ اسماعیل کو شدید چوٹ بھی آئی۔ جنگ مایار کے بعد بارکزئی کا نشہ بیٹھ گیا اور مجاہدین پختونخواہ کے بیشتر اور معروف علاقوں پر فتح حاصل کر کے ایک اسلامی ریاست بنانے کی راہ میں حائل رکاوٹیں تقریباً ختم ہوئیں۔ سرداران پشاور بھی ظاہری طور پر معافی کے طلب گار ٹھہرے جس پر ارباب فیض اللہ نے صلح کے شرائط کر کے اُن سے آئیندہ کے لئے مجاہدین کے خلاف اقدام نہ کرنے کا اقرار لیا اور پشاور کی حکومت دوبارہ سلطان محمد خان کو سونپ دی گئی۔ اگرچہ اِس فیصلے سے سید صاحب کے اپنے رفقاء بھی نالاں تھے حتیٰ کہ ایک بدھ رام نامی ساہوکار نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ جتنی رقم کی بھی ضرورت ہو ہم سے لے لیں لیکن پشاور کو نہ چھوڑنا کیونکہ سید صاحب کی آمد سے مسلمان تو کیا غیر مسلموں کو بھی آرام اور آمن سے زندگی گزارنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔

پشاور کے مسئلے سے فراغت پانے کے بعد آپ پنجتار آئے آمن و آمان کی فضاء قائم تھی ایک اسلامی ریاست کا خواب حقیقت میں بدل چکا تھا بادی النظر میں حالات موافق اور سازگار تھے

پختونخوا کے ہر گوشے سے وفود جوق در جوق آ کر اپنے اپنے علاقوں کیلئے قاضی القضاء اور اعمال کا تقاضا کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں سلطان محمد خان تو وقتی طور پر خاموش رہے مگر انتہائی راز داری سے مجاہدین کے خاتمے کے منصوبے کے لئے جال بننے میں لمحہ لمحہ کو بروئے کار لانے میں مصروف رہے۔ اِس کام کے لئے اُس نے سب سے پہلے موقع پرست اور مادہ پرست مولویوں کو خرید کر اُن سے مختلف قسم کے فتوے تیار کروائے کہ سید صاحب اور آپکے ساتھی آزاد خیال اور لادین ہیں اور یہ کہ ہندوستانی مجاہدین انگریز کے ایجنٹ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پشتون دین کے معاملے میں اتنے سادہ اور ایک راستے کے روادار ہیں کہ وہ علماء وقت پر حد سے بڑھ کر اعتماد کرتے ہیں۔ اُنکے ہر بات کو قول اور سند کے طور پر مانتے ہیں۔ اپنے معاملات کا کل اختیار اُنکے سُپرد کیئے ہوتے ہیں۔ اور اُنکے معمولی اشارے کو بھی دلیل اور ایقان سمجھ کر جانوں تک گنوانے سے بھی دریغ نہیں کرتے لیکن علم کی کمی اور آندھی تقلید کی بدولت علماء حق اور علماء سوء کے درمیان فرق روا رکھنے کے ادراک سے بالکل قاصر ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب اُن مادہ پرست ملاؤں کے فتوے منظر عام پر آ کر عام لوگوں اور خوانین کے کانوں تک پہنچ گئے تو سارے پختونخواہ میں مجاہدین کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک کر شعلے بلند ہوتے گئے اور اب انہوں نے تحریک مجاہدین کی مخالفت کو جہاد اور مجاہدین کو قتل کرنے کے فعل کو جہاد اکبر قرار دیکر ہر گاؤں ہر قریہ اور ہر دیہات میں ایک ہی وقت اور ایک ہی گھڑی پر مجاہدین پر قیامت صغریٰ نازل کرنے لگے۔ اُن کو جہاں بھی پایا شہید کر دیئے گئے حجروں میں اُنہیں گھیر کر شہید کر دیئے گئے، راستے میں اُنہیں قابو کر کے ان پر ظلم کے پہاڑ ڈھا دیئے گئے۔ حتیٰ کہ مسجدوں میں بھی اُنہیں نہیں بخشا گیا اور انتہائی سفاکی اور بے دردی سے قتل کر کے اُنہیں شہادت کا گھونٹ پینا پڑا ایسے حالات میں سید صاحب کیسے مزید ٹھر سکتے تھے۔ اسلئے ہمیشہ کے لئے اِس دھرتی کو خیر باد کہہ کر اپنے باقی مجاہدین کے ساتھ ہزارہ روانہ ہوگئے 8 مارچ 1831ء کو آپ سجوں نامی مقام پہنچ گئے۔ وہاں سے 17 اپریل کو بالاکوٹ روانہ ہو گئے وہاں سکھوں کے خلاف اپنے مجاہدین سمیت بے جگری سے لڑے اور آخر کار طویل مجاہدانہ سرگرمیوں اور طویل سفر کے بعد 06 مئی 1831ء کو جام شہادت سے سرفراز ہو کر ابدی سرخروائی سے بہرور ہوئے اس جنگ میں سید صاحب کے دست راست اور شاہ

ولی اللہ کے خاندان کے چشم چراغ شاہ اسماعیل سمیت 300 مجاہدین شہید ہو گئے جبکہ سکھوں کے تقریباً 700 لشکریوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا بالاکوٹ کی دھرتی تحریک مجاہدین اور سید احمد شہید کے لئے ایک اور تاریخی باب کے اجراء کے ابتدا کرنے لگے۔ جنگ بالاکوٹ کے بعد اُن بچے کھچے منتشر مجاہدین کو سنبھلنے اور یکجا ہونے کا موقع ملا تو اُنکی جمعیت 700 تھی۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد

سید صاحب کی شہادت کے بعد مجاہدین کو کافی عرصہ بہت کسمپرسی اور ناکارصورت حال کا سامنا کرنا پڑا اور منتشر ہو کر اُنہیں در در خاک چھاننا پڑا البتہ ہمت نہ ہاری اور آخر دین کی سربلندی کے خاطر ایک بار پھر ایک نئی پلیٹ فارم تلے جمع ہو کر سابقہ مرکز پنجتار کا رخ کرنے لگے۔ لیکن حالات کو سازگار نہ پا کر کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد بونیر آئے اور یوں بونیر سے یہ قافلہ نواب آمب کے پاس پہنچا نواب آمب نے اُنکی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر مولوی ولی محمد کو اگروہ کا حاکم مقرر کر کے اگروہ بھیج دیا۔ لیکن مقامی باشندوں اور خصوصاً علاقہ ٹکری کے مقامی آبادی اور مجاہدین کے درمیان ناچاقی کے نتیجے میں علاقے کے لوگوں نے نواب آمب سے مجاہدین کو واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔ اِس پر نواب کے دِل میں بھی مجاہدین کے لئے فتور پیدا ہو گئے اور مابین میں کشیدگی بڑھی مجبوراً مجاہدین ستھانہ آئے یہاں اُنکے طاقت میں روز افزوں اضافہ ہوا۔ ہندوستان سے اُنکے لئے امداد کا سلسلہ بھی جاری ہوا کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد مقامی سیاست اور علاقے کے قبائلی نظام نے اُنہیں بھی استعمال کر کے فتح خان کے خلاف جنگ میں دھکیل دیئے۔ لُوپی کے قریب جنگ میں مجاہدین نے شکست کھائی اور اسکی طاقت کمزور پڑ گئی اس صورت حال نے مولوی ولی محمد کو دِل برداشتہ کیا اور وہ یہاں سے ہندوستان چلے گئے۔ 1853ء میں انگریز نے حسن زئی پر لشکر کشی کی تو مجاہدین نے حسن زئی کا بھرپور ساتھ دیا جسکی پاداش میں انگریز نے مجاہدین کے مرکز ملکا پر حملہ کر کے برباد کر دیا۔ اور حسن زئی اور خدوخیل سے انگریز نے عہد و پیماں لیا کہ مجاہدین کو اپنے اپنے علاقوں میں قیام کی

اجازت نہیں دینگے ۔اِس دوران مجاہدین نے واپس آکر ملکا میں پناہ لیا اور وہاں رہنے لگے۔ 1861ء میں مجاہدین پھر جب خدوخیل اور جدون میں نمودار ہونے لگے تو انگریز نے جدون پر لشکر کشی کی۔ نتیجے میں جدون والوں نے آئندہ مجاہدین کو قیام کی اجازت نہ دینے پر جان چھڑایا اور تھوڑا عرصہ بعد مجاہدین نے پھر سے ستھانہ کا رخ کر کے وہاں رہنے لگے یہاں اُنکے قدم خوب مضبوط ہوئے۔اُنکے طاقت میں روز افزوں اضافہ ہوا اُنہیں ہر قسم سہولت اور مقامی آبادی کی طرف سے بھر پور حمایت حاصل رہی اور مجاہدین کی جہادی سرگرمیوں میں تیزی آنے لگی۔اب انگریز کو فکر دامن گیر ہوئی اُسکو اپنی شکست کا عکس واضح نظر آنے لگی۔اور ایک فیصلہ کُن جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ یہ جنگ تاریخ میں جنگ امبیلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ وہ تاریخی جنگ ہے۔ جس میں ہندوستانی مجاہدین ، قبائلی جانبازوں اور سارے پختونخواہ کے کونے کونے سے سرفروشان دین نے حصہ لیا۔اِس جنگ کے لئے فرنگی نے پوری دفاعی ،حربی اور فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا۔ پوری پنجاب سے تربیت یافتہ اور جنگی ساز وسامان سے لیس دستے منگوائے گئے۔ وائسرائے کے سپیشل گارڈ سے کمانڈو بلائے گئے گورنر کے دفاع میں صرف 24 سپاہیوں پر مشتمل دستہ چھوڑا گیا لیکن تمام تر جنگی حکمت عملی اور انتظامات کے باوجود انگریزوں کی ایک بھی نہ چلی اور اُنکے سارے کے سارے منصوبے اِن بے سروسامان اور نہتے مجاہدین نے خاک میں ملا دیئے اور پھر فرار کی راہیں تھکنے لگے۔اُنکی فوج کی بڑی تعداد کو قتل کر دیا گیا اور اُنکے لاشیں کئی دِنوں تک چیلوں اور گیدڑوں کی خوراک بنتی رہی۔ چیمبرلین جیسے جنرل کو شدید چوٹ نے نڈ حال کر کے میدان جنگ چھوڑنے میں عافیت سمجھی میجر دیاس بھی بُرے طرح زخمی ہوئے اور ایک روایت کے مطابق انگریز اپنے 900 فوجیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

پشتو کے اِس مصرے سے گورا فوج کے حشر کا خوب اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

د امبیلے گیدڑ سار به شو

خوراك ئے سه شو دگوراؤ لڑمانونه

اور آج دس سالوں میں امریکہ نے افغانستان میں مجاہدین کے ہاتھوں جو ذلت اُٹھائی

بے شمار لاشوں کا تحفہ وصول کیا تقریباً 50 کھرب ڈالر گنوائے اُنکی فوج کی بیشتر تعداد ذہنی مریض اور بڑی تعداد مفلوج ہو کر زندگی کے گاڑی چلانے سے ہاتھ دھو بیٹھے آج فرار کے راستے کا انتخاب کر کے اُسکے ڈھونڈنے کے لئے سینکڑوں بہانے تراشتے اور ہزاروں منصوبے بنا رہے ہیں۔اور تب تک بھٹکتے پھیر رہے ہیں۔اسکے برعکس جنگ امبیلہ میں انگریز نے ہوشمندی کا مظاہرہ کر کے بروقت فرار کا بہانہ ڈھونڈنے میں کامیابی حاصل کی ندامت کا سر جھکائے واپس اپنے اپنے بیرکوں میں چلے گئے اور مزید نقصان سے بچ گئے۔

معرکہ امبیلہ کے بعد

معرکہ امبیلہ کے بعد مجاہدین دو ٹولیوں میں تقسیم ہو کر ایک نے مولوی عبداللہ کی زیر قیادت دریائے برندو کا رخ کیا اور دوسرا مخصوص تعداد کے ساتھ محمد اسحاق اور محمد یعقوب کے ہمراہ سید مبارک شاہ کے پاس ملکا میں آباد ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد چغرزئی نے اُنہیں رہنے کے لئے ٹانگوڑہ اور ٹبڑہ نامی دو دیہات دے دیئے اور مجاہدین یہاں ڈیرہ ڈال کر رہنے لگے۔ٹانگوڑ کے مقام پر اُنھوں نے ایک مسجد کی تعمیر کی اور گاؤں کے شمالی جانب بہنے والے خوڑ سے نہر نکال کر مسجد کے متصل پن چکی بھی بنائی روحانی تربیت کیلئے خانہ خُدا تھا۔اور دنیاوی ضروریات کے پیش نظر پن چکھی کا اجراء کیا تاکہ رزق حلال کما کر ایک تو مقامی آبادی پر اقتصادی بوجھ نہ بنے اور دوسری مجاہدانہ سرگرمیوں کے ساتھ کسب حلال کا عملی مشق بھی جاری رہے۔ یہاں اُنہیں ایک خاموش ماحول تو میسر آیا۔اور پُر سکون وادی میں عبادت وریاضت کی سعادت کا اچھا خاصا موقع بھی ہاتھ آیا۔مگر ساتھ اُنہوں نے بُرے دن بھی دیکھے اُنکو چیچک کے مُہلک وبا نے آلیا جسکی شدت کے مارے کئی مجاہدین شہید ہوئے اور اُنہیں ٹانگوڑہ گاؤں کے شمالی جانب دفن کر دیئے گئے۔اُن کی یادگاریں آج بھی ٹاگوڑہ کی مٹی نے اپنے پاس محفوظ کی ہوئی ہیں۔

دوسری جانب اُن بے چاروں کے ہر فعل پر یہاں کی قبائل کی کڑی نگرانی رہی۔اِس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض قبائل اُنکے یہاں موجودگی کو اچھے نظروں سے نہیں دیکھتے تھے اور اُنکے کام میں روڑے اٹکانے اور اُنکے سرگرمیوں پر قدغن لگانے میں اس قدر پیش پیش رہے کہ ایک دن 1866ء

میں جب مولوی عبداللہ نے بٹاڑہ میں اپنے تحفظ کے لئے بُرج تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو قبائلوں نے اسکی اجازت نہیں دی۔ کہا جاتا ہے۔ کہ اِن دنوں مجاہدین کے ملکا میں رہائش پزیر گروہ اور چغرزئی کے مجاہدین کے مابین سخت کشیدگی جاری تھی۔ اول الزکر گروہ نے انگریزوں سے براہ راست نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ جس پر مئوا خرالزکر گروہ کے امیر عبداللہ نے درمیان میں حائل ہو کر اُسکے اس ناپاک منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ اور یوں دونوں گروہ کے درمیان پھوٹ پڑ گیا۔

باجکٹہ آمد

فروری 1868ء میں رئیس باجکٹہ عظیم خان مجاہدین کو اپنے ہاں باجکٹہ می بسانے کی دعوت دی۔ ساتھ ساتھ فیروز شاہ کی قیادت میں بونیر کا لشکر بھی باجکٹہ کے قریب جمع ہو رہا تھا۔ جو کہ اخوند آف سوات کے معتقدین کے آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ اور اخوند صاحب کے دست راست میر جی نے ایمر جنسی بنیادوں پر تمام قبائل پر مشتمل جرگہ بُلایا۔ اور مجاہدین کا راستہ روکنے اور انہیں چغرزئی سے بھی نکالنے کے لئے ہر قسم قربانی دینے کیلئے تیار کیا۔

" عظیم خان، زیداللہ خان اور نواب خان نے یہ حالات دیکھ کر خاموش رہنے کو غنیمت جانی اور مجاہدین کو وہاں سے نکال کر ملکا چلے گئے ابھی دو ماہ کا عرصہ نہیں گزرا تھا۔ کہ زیداللہ خان کو اخوند کے معتقدین نے اُنکے گھر ہی میں قتل کر دیا۔ مجاہدین مسلسل افراط وتفریط سے ملے بونیر میں اُنہیں چھین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ٹباڑہ میں بھی گھمبیر صورت حال کا سامنا کرنا پڑا چغرزئی کے گلیم بوری (میرے خیال میں گلونو ناوڑی لگتا ہے) میں اگر چہ تھوڑی بہت آرام میں رہے تب اخوند صاحب کی بڑھتی ہوئی شہرت اور طاقت نے انکے نیندیں حرام کیں اور آخر یہاں سے بھی کوچ کرنے پر مجبور ہو کر دریائے سندھ کے کنارے موضع بہار ور بعد میں موضع جودھ باجا پہنچے اِن علاقوں میں بھی وہ مختلف مصائب کا شکار ہو کر اور اُنکی سرگرمیوں کو بعض علاقوں نے سیاسی اور اقتصادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے پر وہ حسن زئی چلے گئے یہاں اُنہیں پلوزئی کے ملک حبیب اور حسن زئی کے ایک پیرزادہ کی سفارش پر ''میدان'' کا علاقہ رہنے کے لئے مل گیا۔ یہاں اُنہوں نے خوب طاقت پکڑی انگریز لشکر نے اُن قبائل پر حملہ کیا۔ مجاہدین انگریز کے خلاف ڈٹ کر لڑے۔ تاہم اُنکی بیشتر تعداد نے

شہادت حاصل کی انگریزوں نے پلوسئی میں اُنکے آبادی کو مسمار کیا اور اس جہادی قافلہ نے ایک بار پھر علاقہ چغرزئی کا رخ کیا۔ مجاہدین کی مثال ایک قسم کی ریڈ الرٹ دستے کی تھی۔ جہاں بھی اس سرزمین پر دشمن کے ناپاک قدم اُٹھتے وہ اسی وقت اُنکے عزائم کو خاک میں ملانے کیلئے تن من دھن سے بے پروا میدان میں کود پڑتے۔

قبائلوں کے مابین اکثر رزم و بزم کا سلسلہ اُنکی زندگی کا لازمی جز ہے۔ یا تو دشمن کے خلاف میدان جنگ میں مصروف رہتا ہے اور یا اپنے ہی قبیلے اور خاندان کے درمیان کسی نہ کسی بات کو وجہ نزاع بنا کر اُلجھے ہوئے ہوتے ہیں۔

1877ء میں بونیر اور سدوم کے قبائل کے درمیان جاری چپقلش جنگ میں تبدیل ہوئی جس میں بونیر کے نوریزئی دولت زئی اور عائشہ زئی قبیلوں نے ایک کر کے علاقہ سدوھم پر ٹوٹ پڑے۔ مقامی آبادی نے خوب ڈھٹائی دکھائی۔ نتیجے میں بونیر کے 21 آدمی جان بحق 30 زخمی اور 14 کو گرفتار کر لیا گیا۔ اِس حملے کے اصل محرک عجب خان نامی رئیس کو انگریز عدالت نے 1878ء میں پھانسی پر چڑھایا۔ اور قبائل پر پابندی لگا کر ناکہ بندی کر دی۔ جسے بعد میں عائشہ زئی کے شرائط ماننے پر ختم کر دیا گیا۔ اسی طرح 1885ء میں اہل بونیر کے موضع پیر سائے کو جلانے پر بھی انگریز نے ناکہ بندی کی اور بعد میں شرائط ماننے کے بعد ناکہ بندی اُٹھا کر آمد و رفت بحال ہو گئی۔

معرکہ کوہ سیاہ ثانی

1891ء میں جب انگریز کے قدموں نے اس سرزمین کو چھوا اور اُنکی دہشت زدہ حملہ قبائلی علاقے پر ہوا۔ تو مجاہدین نے بھی قبائل کے دست راست بن کر غازیکوٹ کے مقام پر انگریز پر شب خون مارا۔ تاہم انگریز کے کثیر تعداد کے سامنے نہ جمتے ہوئے واپس لوٹے 1893ء میں مجاہدین نے ملکا کے قریب امازئی میں نوآبادی قائم کرنے کا فیصلہ کیا اس وقت انگریز نے چالاکی سے کام لیکر خاموش رہا۔ اسکے بعد انگریز ملاکنڈ یا سوات کی طرف حملہ کرتا تو مجاہدین مولوی عبداللہ کی قیادت میں سربکف میدان جہاد میں حاضر ہوتے۔

1894ء میں سرتور فقیر کی سرکردگی میں سوات و بونیر کے غیور عوام نے ملاکنڈ پر حملہ کر کے انگریز کے رونگھٹے کھڑے کر دیئے۔ اُنکے اسلحہ ڈپو کو اُڑا دیا اور اُنکے لشکر کی بڑی تعداد کو نیست و نابود کر کے دم لیا۔

اِس تاریخی جنگ میں بونیر کے سالارزئی قبیلے نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ اور جوانمردی کے جوہر کھائے جس پر یہ علاقہ انگریزوں کے نظر میں معتوب ٹھرا اور لشکر کے ساتھ علاقہ سالارزئی پر اقدام کیا لشکر کی قیادت جنرل سر بنڈن بلڈ کر رہے تھے۔ مورہ تنگے پر قبضہ کیا اور اہل بونیر کی قوت کو منتشر کرنے کے لئے جنگی حکمت عملی کے تحت دوسرا حملہ براستہ پیر سائے حملہ پر کیا جس سے بونیر کے لوگوں کی قوت تقسیم ہو کر بونیر کو روندا گیا۔ اور اہل بونیر پر جرمانہ لگا کر 19 جنوری کو واپس لوٹے اس جنگ میں ہندوستانی مجاہدین اپنے قبائلی میزبانوں کے ساتھ شانہ بشانہ لڑے اور جنگ کے بعد پھر سے وادی چغرزئی کے گود میں سر رکھ دی۔ واضح رہے کہ اس انگریزی حملے میں مشہور ماہر آثار قدیمہ اور نیشنل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سٹین گور لشکر کے ساتھ تھے۔ اُس نے یہاں بدھ مت کے مختلف مقامات کا رپورٹ تیار کیا جو گیرارئی تختہ بند اور باپوخہ وغیرہ میں دیکھے گئے تھے جو کہ بونیر کی دھرتی پر مرتب ہونے والا غالباً پہلا ارکیالوجیکل سروے رپورٹ مانا جاتا ہے۔

جہاں بھی انگریز کے خلاف تحریک اُٹھی تو مجاہدین نے ہراوّل دستے کا کردار ادا کیا یہاں تک کہ 1915ء میں جب مجاہدین اسلام اور عظیم حاجی صاحب ترنگزئی نے سدھوم کی سرحد پر ہل چل مچائی تو بھی مجاہدین اُن کے دست راست بنیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُنکی اتحاد بھی اپس کے اختلافات کا شکار ہو کر دو دھڑوں میں تقسیم ہوئے۔ ایک ٹولہ مولوی نعمت اللہ کے زیر قیادت آسکس میں رہا جبکہ دوسرا ٹولہ مولوی فضل الٰہی کے زیر کمان چمرکنڈ (باجوڑ) کو ہجرت پر مجبور ہوا چمرکنڈ مجاہدین کے لئے سازگار میدان جہاد رہا۔ کیونکہ حاجی صاحب ترنگزئی نے آخر دم تک انگریزوں پر عرصہ حیات تنگ کیا تھا اور مجاہدین ترانگوئی صاحب کے شانہ بشانہ میدان میں پیش پیش رہے۔

حاجی صاحب ترنگ زئی، مختصر تعارف

تحریک آزادی ہند کا مجاہد حاجی صاحب کا اصل نام فضل واحد اور والد محترم کا نام فضل احمد تھا۔ آپکا پدری سلسلہ شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے اور ماں کی طرف سے شیخ رحمکار کا کا صاحب کی اولاد میں سے ہے۔ 1846 میں آپ چارسدہ کے ایک گاؤں ترنگ زئی میں پیدا ہوئے۔ مجاہدانہ ذوق اور اسلام سے والہانہ عقیدت آپکو ورثے میں ملی تھی آپکے جد امجد نے اسلامی سلطنت کی قیام میں تحریک مجاہدین کے روح رواں سید احمد شہید کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ انگریز کے خلاف آپکے دادا اور والد کے کارنامے تاریخ کا زرین باب ہے۔

یہ موروثی جذبہ تھا کہ حاجی صاحب نے 1897 میں اپنے مرشد ہڈے ملا کی اجازت سے اپنے معتمد قبیلوں اتمان خیل اور مامون زئی وغیرہ کے مجاہدین کا ایک بھاری لشکر تیار کر کے انگریزوں کے مقابلے کیلئے تیار کر لیا۔ دوسری طرف ہڈے ملا کے دوسرے خلیفہ بونیر کے سرتور فقیر بھی دیر باجوڑ اور سوات بونیر کے مجاہدین کے بھاری دستے کے ساتھ چکدرہ پہنچ گئے

حاجی صاحب نے ملاکنڈ اور سرتور فقیر نے چکدرہ کے مقام پر انگریزی فوج کا زبردست مقابلہ کیا اور انگریزی فوج کے گولہ بارود اور اسلحہ کی ڈپو کو اُڑا کر انگریز فوج کو تاریخی سبق سیکھا دیا اس جنگ ملاکنڈ کے بعد حاجی صاحب خاموشی کے ساتھ ترنگزی چلے گئے اور انگریزوں کے خلاف مصروف عمل ہونے لگے۔

جنگ بونیر کا پس منظر اور حاجی صاحب کی آمد

اُنیسویں صدی کے اختتام تک انگریز دنیا پر چھا گئے تھے۔ اور دنیا کے بیشتر ممالک کو اپنی باجگزاری میں باندھ دیئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اور برصغیر کی مٹی کو تو سونے کی چڑیا کا خطاب مل چکا تھا۔ قدرتی بے پناہ وسائل، جنت نظیر محل وقوع، دنیا کی سینکڑوں تہذیبوں کا گہوارہ اور موسمی لحاظ سے منفرد خصوصیات کا حامل برصغیر کی مٹی لازوال حسن سے لبریز رہا ہے۔ دوسری طرف خلافت ترکیہ تمام مسلمانوں کی مشترکہ سلطنت، اتحاد و اتفاق کا مظہر اور مسلمانان عالم کی سینکڑوں سالہ تاریخ اور فتح کی میراث تھی۔ اسکے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں اگرچہ مسلمان انگریزوں کے زیر تسلط غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔

لیکن اُس وقت برصغیر میں سینکڑوں ایسی ریاستیں بھی تھیں جو روز اول سے آزاد و خودمختار زندگی گزار رہے تھے۔ اور اپنے قبائلی سسٹم میں کسی دوسری قوم کو خاطر میں لانے کو کسی قیمت پر مداخلت کیلئے تیار نہ تھے۔ خصوصاً خیبر پختونخواہ کے قبائلی علاقہ جات کے پشتون قبائل اپنی آزادی اور خودمختاری میں نہ سیکھ کے زیر اثر رہ چکے تھے۔ اور نہ انگریز کے ناپاک قدم کو اپنی سرزمین پر جمنے دیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جہاں پر اسلام پر سر قربان کرنے کا موقعہ آیا اور جہاں بھی مسلمانوں پر ظلم و ستم کی داستان سنی اسی وقت اسلام دشمن عناصر کے خلاف تلوار تان اور کمر باندھ کر دنیا کے طول و عرض میں اپنے مسلمان بھائی کی مدد کی ہے۔

جب 1914 میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی دنیا کے دوسری ممالک کی طرح روس، برطانیہ، امریکہ، اٹلی، اسٹریلیا، بیلجیم، پرتگال وغیرہ جنگ میں کود پڑے۔ جرمنی نے تقریباً ساری دنیا کو چیلنج کر دیا۔ خلافت ترکیہ نے بھی جرمنی کا ساتھ دیکر میدان میں کود پڑا اسلئے اتحادیوں نے خلافت ترکی کو پارہ کرنے کا ناپاک ارادہ کیا تو برصغیر کے مسلمانوں نے اسے اپنی آزادی اور مسلمانوں کی اتحاد پر ضرب کاری سمجھتے ہوئے اتحادیوں کی اس حرکت کو اسلام دشمنی قرار دیکر انگریزی حکومت کو خبردار کیا

کہ اگر ترکوں پر کوئی ظلم کیا گیا تو برصغیر کے مسلمان اپنے ترک بھائیوں کے دوش بدوش اس اسلامی سلطنت کو بچانے کیلئے ہر ممکن اقدام کرینگے۔

قبائلی علاقہ جات

انگریزوں کو سب سے بڑا خطرہ ان پہاڑوں میں بسیرا کرنے والے قبائل سے تھا۔ ان قبائلی جوانوں اور بزرگوں کے ہاتھوں انگریز نے میدانی علاقوں میں ایک لمحہ بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ اُن قبائل علاقہ جات کو آزادی ہند کے مجاہدین اور قائدین کیلئے حصار بند مورچوں اور قلعوں کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں سے آزادی کی تحریکیں اُٹھ کر ایشیاء کے طول و عرض پر چھا گئے اور انقلاب برپا کر کے انگریز اور دوسری قوموں کو ناکوں چنے چبوانے پر مجبور کیا تھا۔ تحریک مجاہدین کی بالیدگی اور مضبوطی میں ان پہاڑی دوروں اور چوٹیوں کا بڑا رول رہا ہے۔ تحریک مجاہدین کی بڑی تعداد یہاں کے درودیوار میں ایلیٹ فورس کے طور پر موجود رہ کر وقت آنے پر گوروں کے سروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا ہے۔ اور آزادی کی شمع کو سارے برصغیر میں روشن کیا ہے۔ انکے علاوہ اُس وقت آزادی کے مجاہد ہندوستان، پختونخواہ، افغانستان اور دوسرے مختلف ممالک میں آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔

عبیداللہ سندھی، شیخ الہند محمود الحسن، حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیز گل، ابوالکلام آزاد اور دوسرے اکابرین برصغیر کے کونے کونے اور افغانستان، ترکی اور مقامات مقدسہ میں مسلمانوں کی روحانی آبیاری اور مجاہدانہ تربیت میں ہر لمحہ مصروف عمل تھے۔

شیخ الہند کی طرف سے حاجی صاحب کو پیغام پہنچا تھا۔ کہ وہ پوری طور پر قبائلی علاقے میں جا کر انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کریں تا کہ انگریزوں کی فوجی طاقت منتشر ہو جائے اور ترکوں کے خلاف اپنی پوری قوت خرچ نہ کر سکیں اُنکی نظر میں بونیر کی وادی اور درہ امبیلہ اسلئے اہم تھے۔ کہ قبائل کو رام کرنے کے لئے یہ مقامات اور یہاں کے قبائل سب سے بڑی رکاوٹ تھی کیونکہ سوات بونیر اور دوسرے علاقوں کے مجاہدین کا یہ مرکزی مقام اور مضبوط جنگی گڑھ تھا۔ اور اس جدرے کو فتح کرنا

سارے قبائلی علاقہ جات کو فتح کرنیکی مترادف تھا۔ یہاں کئی فاتحین کا قوت بازو ٹوٹا ہے اکبر اعظم نے ان پہاڑوں میں اپنے بھاون ہزار (52000) فوج اور اپنے نورتن بیربل سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ سیکھ کا سینگ ٹوٹا ہے۔ اور انگریز کو کئی بار اپنے ایلیٹ فورس اور افسروں کی ازیت ناک موت پر کفِ افسوس ملنا پڑا ہے۔

شیخ الہند کو معلوم تھا کہ انہی پہاڑی دروں سے سربکف مجاہدین گورا فوج کی طاقت کو پاش پاش کر کے یہاں جنگ میں مصروف رکھیں گے اور اسی طرح اپنے ترک بھائیوں کی مدد کی جائیگی۔

بونیر آمد

شیخ الہند کا حکم پاتے ہی حاجی صاحب بونیر آمد تیاریوں میں مصروف ہونے لگا۔ اور ایک رات اپنے بیٹوں اور دوسرے علماء و مشائخ اور مجاہدین کے ساتھ ترنگزئی سے ہجرت کر کے قبائلی علاقوں کا رخ کیا 20 جون 1915 کی رات کئی کٹھن مراحل سے گزر کر وادی بونیر کے ایک گاؤں کنگر گلی پہنچے یہاں کے لوگوں نے اسے گاؤں لے جا کر انکا شاندار استقبال کیا اور آپکے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔

کنگر گلی سے رخصت ہو کر مجاہدین کا یہ قافلہ لوگوں کے گہرے عقیدت اور محبت کے سبب جگہ جگہ ٹھہرنے کے بعد تیسرے دن چناڑ نامی گاؤں پہنچا یہاں کے پشتون قبیلے نے حاجی صاحب کا بہت احترام کیا۔ اس جہادی قافلے کے ساتھ ہر قسم تعاون اور قربانی کی یقین دہانی کی اور موجودہ چناڑ سکول کے قریب اسے رہنے کیلئے رہائش کا بندوبست کیا۔ اس عمارت کی نشانی آج بھی موجود ہے۔ اور یہاں سے حاجی صاحب جہادی مہم کا عملی آغاز کرنے لگے۔ آپ خود چناڑ میں مجاہدین کے ساتھ مقیم رہے اور اپنے اہل خانہ کو سلارزئی کے مرکزی گاؤں جوڑ میں بھیج دیا۔ چناڑ میں کچھ عرصہ رہ کر لوگوں کو جہاد کے پرچم تلے جمع کیا۔ اور یہاں سے مختلف علاقوں کے دوروں کا پروگرام بنایا۔

سید احمد شہید نے تقریباً 80 سال پہلے چنگئی سے اپنے جہادی دورے کا آغاز کیا تھا۔ اور آج آپکے اس تحریک کے مردِ مجاہد حاجی صاحب وادی بونیر کے چناڑ نامی گاؤں سے جہادی دورہ کا ابتداء کرنے لگے یہاں سے آپ نے سوات، بونیر اور چغرزئی کا کامیاب دورہ کیا ہر جگہ آپ کا

شاندار استقبال کیا گیا اور ہزاروں کی تعداد میں قبائل آپکے دست مبارک پر بیعت جہاد کر گئے۔ علاوہ ازیں حاجی صاحب نے اس سلسلے میں مختلف قبائل کے نام خطوط بھی لکھے اور پختونخواہ کے کونے کونے میں اس جہادی نعرہ کو متعارف کرا دیا گیا۔ اپنے دوروں کے سلسلے میں انگریزوں نے اپنے ایجنٹوں اور کاسہ لیوں کے ذریعے آپکی قتل کے منصوبے بھی بنائے لیکن جیسے اللہ رکھے اسے کون چکھے کے مصداق وہ بال بال بچ گئے۔ چغرزئی کے دورے کے موقع پر انگریزوں کا ایک ایجنٹ حاجی صاحب کو قتل کرنے چغرزئی کے میرہ گئی گاؤں تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن خان آف میرہ گئی بیخانئی احمد خان بابا کے دوربین نگاہ اور قیافہ شناس مزاج کی بدولت جب اسکے حکم پر آپ کے ناظر نے اسکی جامہ تلاشی لی۔ تو اس کے قبضے سے خنجر برآمد کی گئی اور جب اس سے تفتیش کی گئی تو اس نے اقرار کر کے کہا کہ اس نے انگریز سے حاجی صاحب کے قتل پر پیسے کھائے تھے۔ اور یہ کہ وہ بہت دور سے حاجی صاحب کا پیچھا کر رہے تھے لیکن موقع نہ پا سکا اور نوبت یہاں تک آ پہنچی۔

اس طرح انگریزوں نے حاجی صاحب کی ہر حرکت کو نوٹ کرنے کیلئے اپنے ایجنٹ اور کارندے مقرر کیے تھے تاہم آپ کے جہادی جذبے اور غیر متزلزل قدموں کو ڈگمگا سکے اور نہ آپکے مشقت اور بلند حوصلے میں کوئی کمی اور پستی لا سکے۔

کئی دن لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرنے اور مختلف علاقوں کا دورہ مکمل کرنے کے بعد آپ نے بونیر میں ایک بڑے جرگے کے انعقاد کا ارادہ کیا اس میں بونیر کے مختلف قبیلوں کو مدعو کیا گیا۔ میدان جہاد بالکل تیار تھا۔ ہزاروں لوگوں نے بیعت کیا تھا اور آپ کے ایک اشارے کے منتظر تھے۔ حاجی صاحب نے اس موقع پر چرکنڈ میں مقیم سید احمد شہید کے پیروکاروں کے امیر نعمت اللہ کو بھی بلایا تھا۔ امیر نعمت اللہ کو شیخ الہند نے پہلے ہی خبردار کیا تھا۔ کہ جونہی حاجی صاحب ہجرت کر کے قبائلی علاقے میں پہنچے اور جہاد کا آغاز کریں۔ تو سید صاحب کے تمام پیروکار جو چرکنڈ کی بستی مجاہدین میں مقیم ہیں وہ حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کرتے ہوئے فوری طور پر آپ کی قیادت میں جہاد کا آغاز کریں۔

بونیر جرگہ

پشتونوں کا جرگہ ایک ہی آواز پر اکٹھا اور ایک ہی آواز پر منتشر ہوتا ہے۔ جرگے میں جو بھی فیصلہ آتا ہے وہ ساری قوم کو قابل قبول ہوتا ہے۔ اسکی پاسداری قوم کا ہر فرد اپنے اوپر لازم مانتا ہے اور جب بات پشتو روایات اور دین و مذہب کی پاسداری اور حفاظت کی جاتی ہے تو پھر پشتون کسی مصلحت اور وقت کی قید و بند سے آزاد ہوتا ہے اور میدان جنگ اسکی دل کی دھڑکن اور مقصد حیات ٹھرتی ہے۔

بونیر کے قبائل، مولوی نعمت اللہ اور حاجی صاحب کے درمیان 13 جولائی 1915 بونیر میں جرگے کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں کوز اور بر بونیر کے تمام قبیلوں کے عمائدین نے شرکت کی خماری خیل کی طرف سے ناصر بابا، باجکٹہ سے سعد اللہ خان، ڈگر سے محمد ایوب خان، کلپانی سے صدیق بابا اِیلئی سے بابوزے بابا اور گدیزئی سے اڑو خان اور روشم خان اپنے اپنے قبیلوں کے نمائندگی کر رہے تھے۔

جب انگریز کو اس ہونے والے جرگے کی اطلاع ملی تو اس نے خفیہ طریقے سے اس جرگے کو ناکام بنانے کے لئے باجکٹہ کے ایک مولوی صاحب جو کہ میر آف باجکٹہ کے نام سے مشہور تھے کو بھاری رقم دیکر خرید لیا۔ اسلئے کہ انگریز جانتے تھے کہ پشتونوں کے درمیان مذہب اور مذہبی پیشوا کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ اور مذہبی پیشوا کے ہر بات کو قول مان کر بلا چون و چرا تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اسے یہ علم نہیں تھا۔ کہ اگر چہ وہ مذہبی پیشوا کو قومی پیشوا اور روحانی معالج تو مانتے ہیں۔ لیکن جب انہیں مذہبی پیشوا کی ضمیر فروشی وطن فروشی اور ایمان فروشی کا ثبوت مل جاتا ہے۔ تو پھر اسکا منہ تک دیکھنا بھی گناہ کبیرہ کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔

انگریزوں نے پٹھان قبیلوں کو مختلف طریقوں سے یہی سبق دیا جاتا رہا۔ کہ شرعاً خلیفہ المسلمین کی امداد اس صورت میں ہوسکتی تھی کہ اس علاقے کا فرمانروائے افغانستان کوئی اقدام کرتا۔ قبائلی علاقے کی نظریں حکومت افغانستان پر لگی ہوئی تھی۔ کہ وہ کوئی اقدام کریں تو یہ بھی اپنی بندوقیں داغنا شروع کردیں لیکن امیر حبیب اللہ خان فرمانروائے افغانستان کچھ اس طرح انگریزوں کے زیر اثر آچکا کہ اسے خلافت عثمانیہ کی کوئی ہمدردی حرکت میں نہ لاسکی اُلٹا اس نے اپنی طاقت و بساط کے

مطابق قبائیلوں کو خاموش رکھنے کی کوشش جاری رکھی اور اس بے حسی کی جرم میں امیر حبیب اللہ خان کو بعد میں گولی کا نشانہ بننا پڑا۔

بونیر میں بھی وقتی طور پر انگریز کی چال کامیاب رہی ملا میر کو رشوت دیکر تیار کیا گیا اور اس نے پشتونوں کے بھرے جرگے میں جہاد کے مخالفت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اسلام میں جہاد اس وقت فرض نہیں ہے جب تک کسی اسلامی ملک کا سربراہ یا امیر جہاد کا حکم نہ دے۔

جب جرگے کے سادہ لوح اور کھرے مسلمان عمائدین نے ملا میر کا یہ اعلان سنا تو جرگہ ملتوی ہوا محمد ایوب خان 14 تاریخ کو نوریزئی کے مذہبی لوگوں اور ملا میر آف باجکٹہ سے ملا اور جہاد کے اس موضوع پر تبادلہ خیال کیا۔ دوسری طرف دولت زئی اور نوریزئی کے لوگوں نے حاجی صاحب کو فی الحال جہاد کے موضوع پر کچھ کہنے سے معذرت چاہی اور یہ فیصلہ ہوا کہ عید کے چوتھے روز تک اس موضوع کو نہ چھیڑا جائے۔ اس لئے کہ میر آف باجکٹہ نے سادہ لوح عمائدین جرگہ کو تذبذب اور مخمصے میں ڈال کر کم علمی کے وجہ سے فلسفہ جہاد اور زمینی حقائق کو جاننے میں ناکام ہوئے تھے۔ جس پر حاجی صاحب محمد ایوب کے رویے سے بہت ہی ناامید ہوئے لیکن جونہی بونیر کے عمائدین جرگہ اور لوگوں کو اصل حقائق کا پتا چل گیا۔ تو اہل بونیر کی نظروں میں اسکا (میر آف باجکٹہ) کا وہ مقام نہ رہا جو اس سے پہلے تھا۔ باوجود اس ملا کی مخالفت کے جرگے میں یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ انگریزوں نے ہمارے ملک پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے تمام اسلامی ممالک کو ایک ایک کر کے ختم کیا جارہا ہے۔ ترکی کی اسلامی سلطنت کو ختم کر کے خلافت اسلامیہ کا نام ونشان مٹانے کیلئے تمام عیسائی طاقتیں متحد ہوچکی ہیں۔ عربوں میں نفاق پیدا کر کے انہیں آپس میں لڑایا جارہا ہے لہذا ان حالات میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اسلام کی عظمت اور شان وشوکت کے تحفظ کے لئے خدا کے حکم کی تعمیل میں جہاد کیلئے کمربستہ ہوجائیں۔

اب جرگے میں حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی گئی اور ہر ایک نے وعدہ کیا کہ وہ خدا کے راستے میں جان و مال کی قربانی دینے سے کسی بھی حالت میں دریغ نہیں کرونگا۔

جرگے کے کامیابی کا سن کر انگریز نے حفاظتی اور دفاعی انتظامات کے لئے فوری احکامات

نافذ کر دیئے اور ڈپٹی کمشنر نے حکومت ہند کو مطلع کیا کہ اب یہ امکانات پیدا ہو چکے ہیں۔ کہ بونیر کی سرحد پر حالات بگڑ چکے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بکنے والے بک گئے اور اسلام کے شیدائیوں نے دولت کی انبار، کرسی، خطابات اور جاگیروں کے لالچ کو ٹھکرا دیا اور سر بکف میدان میں نکل آئے۔

ہزارہ، تھاکوٹ، چغرزئی، سوات، بونیر، باجوڑ اور پختونخواہ کے کونے کونے سے مجاہدین کے جتھے در جتھے میدان جنگ میں اُمڈ آنے لگے۔ سارے فروعی مسائل اور اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر تمام قبائلی بلا امتیاز حاجی صاحب کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ سرتور فقیر جو 1897 کی جنگ ملاکنڈ کے بعد سوات پیتئی (فتح پور) میں مقیم تھے۔ اور سنڈاکئی مُلا سے بعض باتوں میں اختلافات بھی رکھتے تھے۔ وہ بھی سارے اختلافات کو پس پشت ڈال کر اسلام کی سربلندی برصغیر کے مقدس مٹی کو انگریزوں سے پاک کرنے اور اسلامی ممالک کو دشمنوں کے پنجے سے محفوظ کرنے کی خاطر جہاد میں اپنے پیروکاروں اور مریدوں سمیت شامل ہو چکا تھا۔ سواتی مجاہدین جوق در جوق پہنچ رہے تھے۔ چغرزئی، حسن زئی اور دوسرے قبیلوں کے تقریباً چار سو مجاہدین کا جتھا علَم جہاد لئے حاجی صاحب کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ بونیر اور چغرزئی کی عمائدین کی باہمی رضامندی سے برشمال کے جمال بابا پالکی میں سوار مشترکہ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے میدان جہاد کے طرف رواں دواں تھے۔ تمام مجاہدین کو مرکزی مقام رستم کے پہاڑ اور درے بتائے گئے تھے۔ اسی طرح حاجی صاحب کے ایک نائب کے ذریعے چکیسر کے لوگوں کی بھرپور شرکت کی یقین دہانی اور جذبہ ظاہر کیا گیا تھا تر کی سے مقامات مقدسہ تک، افغانستان سے باجوڑ اور باجوڑ سے سوات شانگلہ بونیر اور ہزارہ تک انگریز کے خلاف اور خلافت عثمانیہ کی بچاؤ کا ایک ہی نعرہ تھا۔

اعلان جہاد

15 اگست 1915 کو حاجی صاحب نے جہاد کا اعلان کیا۔ مجاہدین اپنے اپنے علم اٹھائے مردان کی طرف روانہ ہوئے اور رستم کے دروں میں نمودار ہونے لگے برطانوی ہند نے بھی فوج کا سہارا لیا اور توپوں اور بندوقوں سے لیس رستم کی طرف پیش قدمی کرنے لگی۔ مردان صوابی وغیرہ کے لوگوں نے مجاہدین کے آمد کا سن کر خوشیاں منائی اور انکا ساتھ دینے کیلئے خوب تیاری کی لیکن انگریز فوج نے گھر گھر پر پولیس کا پہرہ بٹھا کر انہیں محصور رکھا۔

مجاہدین رستم کے دروں اور پہاڑوں میں مورچہ زن تھے اور انگریز اس انتظار میں تھے کہ مجاہدین اگے بڑھیں تو ان پر یلغار کر دی جائے جبکہ حاجی صاحب جو خود کمان کر رہے تھے کی حکمت عملی یہ تھی کہ پہاڑوں اور دروں میں ہی مورچہ بندی کر لیں تا کہ انگریز کی گولہ باری سے محفوظ رہ کر انکا صفایا کر سکیں۔

آخر حاجی صاحب نے موقع پا کر حملے کا حکم دیا۔ حکم پاتے ہی چار ہزار 4000 مجاہدین سرکاوئ کے طرف بڑھے۔ انگریزی فوج بھی رستم سے بڑھی آغاز جنگ پر انگریزی فوج نے توپخانے کے منہ کھول دیے اور گولے برسانے لگے۔ خوب جنگ ہوئی۔ 16 اگست کو مجاہدین برطانیہ کے ہندوستانی سرحد میں تیرہ میل تک گھس گئے۔ اور پہاڑی پر مورچہ بندی کر کے مقیم ہو گئے۔ 17 اگست کو دن دو بجے لڑائی شروع ہوئی اور شام تک مسلسل خون کی ہولی کھیلی گئی۔ شام ہوئی تو مجاہدین پہاڑوں پر چلے گئے 20 شہداء کی لاشیں انگریزوں کے ہاتھوں آئے لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ شہیدوں کے ان لاشوں کو کہاں، کس جگہ اور کس گڑھے میں دفن کیا گیا۔ مگر اندازہ یہی ہے کہ وطن کے ان شہیدوں کی لاشوں کو رستم کے پولیس تھانے کے قریب ہی کہیں ایک جگہ گڑھا کھود کر دفن کیا گیا۔ 20 اگست کی شب کو مجاہدین نے رستم کے کیمپ پر حملہ کیا کیمپ سے برابر توپوں اور بندوقوں کی فائر ہوتی رہی مجاہدین کے اس حملے میں انگریزوں کا بڑا نقصان ہوا اور انگریزوں نے زخمیوں کو سولہ ٹولیوں میں مردان لے گئے 22 اگست کی شب مجاہدین نے پھر حملہ کیا جسکے جواب میں ساری رات توپیں اور بندوقیں چلتی رہیں لیکن اسکے باوجود انگریزوں کو بہت نقصان اُٹھانا پڑا اور انگریز

چالیس ٹولیاں زخمی سپاہیوں کالیکر مردان لے گئیں۔ انگریز کو اپنے قلعوں اور چھاونیوں تک محدود رکھا گیا۔ اور انہیں بہت کوفت اُٹھانی پڑی۔ 24 اگست رات کو مجاہدین نے ایک بار پھر بھرپور حملہ کیا اور کیمپ میں گھسنے کی کوشش کی لیکن چاروں طرف آہنی باڑ اور خندقیں آڑے آئیں البتہ اسی رات انہیں ایک انگریز افیسر ہاتھ آکر اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

25 اگست کو برطانیہ نے پانچ ہزار فوج 2 رسالوں اور 21 توپوں کے ساتھ اچانک تین اطراف سے مجاہدین پر حملہ کیا مجاہدین نے جانبین کی پہاڑیاں پکڑ لیں اور گولہ باری ہونے لگی اس میں ایک انگریز افیسر مارا گیا جسکے مرتے ہی فوج بھاگ کر قلعہ رستم میں پناہ گزین ہوئی۔ اس رات مجاہدین کے دس آدمی شہید اور زخمی ہوئے جبکہ انگریزوں کے تقریباً 600 آدمی قتل اور زخمی ہوئے اسی طرح ایک اور شدید حملے میں انگریز افیسر لفٹنٹ میکنار گولی کا نشانہ بنا اور کئی دوسرے فوجی موت کی وادی میں چلے گئے اس طویل جنگ میں کئی مجاہدین نے خون کا نزرانہ دیکر شہادت سے سرفراز ہوئے تاہم انگریزوں کی بڑی تعداد کو بھی موت کی وادی میں دھکیل دیا۔ اور قبائلی علاقوں میں جمانا تو دور کی بات ہے انہیں یہاں قدم رکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔

یہاں طویل جنگ لڑنے کے بعد حاجی صاحب نے سرتور فقیر کو لیکر سوات پہنچے مینگورہ میں چند روز قیام کیا۔ وہاں سے دریائے سوات پار چنداکوٹ پہنچے اُپ کا قافلہ جہاں بھی جاتا۔ سواتی مجاہدین آپ کا شاندار استقبال کرتا۔ اور اس جہادی قافلے میں شریک ہوتے تھے۔ بونیر کے کم از کم 120 خاندان بھی حاجی صاحب کی محبت میں ہاتھوں میں جہاد کے پرچم اُٹھائے ہوئے تھے۔

رستم میں لڑنے والی انگریز کے خلاف اس جنگ میں بونیر کے تمام قبیلوں نے بھرپور حصہ لیا اور بہادری کے جوہر دکھائے ہر گاوں اور ہر قبیلے نے شجاعت اور جوانمردی کی داستان رقم کی ہے۔ پختونخواہ کے کونے کونے سے آئے ہوئے مجاہدین کا جذبہ مثالی اور قربانی لاثانی رہا رستم اور امبیلہ کے گھاٹیوں، دروں اور چوٹیوں میں دشمن کے خلاف برسرپیکار دکھائے دینے لگے۔ تاہم بونیر کے گاؤں ریگا کے دو فرزندوں کی داستان شجاعت بھی سننے کو ترستے ہیں۔

''ریگا نامی گاؤں میں کریم شاہ اور حضرت میر نامی گہرے دوست رہتے تھے۔ نسبی لحاظ

سے حضرت میر نوریزئی کے ذیلی شاخ بائزئی سے تعلق رکھتا تھا۔ جبکہ کریم شاہ ایک غریب گھرانے کا چشم و چراغ پیشے کے اعتبار سے شاخیل تھا۔ جب انگریز کے خلاف جنگ چھڑ گئی تو دونوں نے قسم اُٹھایا کہ ہم دلیری سے مقابلہ کرینگے اور مرتے دم تک لڑ کر واپس نہیں آئینگے آخر کار کمر ہمت باندھ کر گھر سے نکلے اور رستم تھانہ پر حملہ آور ہوئے لیکن بدقسمتی سے انگریز توپ خانے کے گولے کے زد میں آکر جام شہادت سے سرفراز ہوئے اور انگریزی فوج نے اُن دونوں کے لاشوں کو اپنے گرفت میں لے لی۔ ریگا کا رہنے والا امراد خان بابا کہتے ہیں۔

''میرے والد جو کہ اس جنگ میں لڑے تھے کہتے ہیں کہ حضرت میر اور کریم شاہ کے لاشوں کو انگریز کے قید سے چھڑانے کیلئے ہم نے مسلسل آٹھ رات جان جوکھوں میں ڈال کر سخت مشکلات سے دوچار ہوئے جس رات بھی ہم انہیں اٹھانے کیلئے لپکتے تو انگریز پہردار اُنکے گرد موجود پاکر انتہائی پھرتی سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتے۔ آخر آٹھویں رات موقعہ کو سازگار پاکر انہیں اُٹھا لئے۔ دیکھا تو اٹھویں رات بھی اُنکے جسموں سے تازہ خون بہہ رہا تھا۔ ہم انہیں اُٹھا کر گاؤں لے آئے اور دفن کردیئے''

آج بھی ریگا کے قبرستان میں اُنکی پرنور مرقدیں اس تاریخی جنگ کی یادیں تازہ کرتی ہیں۔

جنگ کے بعد ایک انگریزی دستہ انتہائی رازداری سے سرتور فقیر کو گرفتار کرنے ریگا آئے اور گاؤں کے جنوباً واقع ''نجلہ ونڈ'' نامی مقام پر پڑاؤ ڈال دیا لیکن سرتور فقیر کو نہ پاسکے کیونکہ سرتور فقیر جنگ ملاکنڈ کے بعد بمعہ بال بچوں سوات فتح پور منتقل ہوچکے تھے۔ اور پھر اس جہادی مہم میں حاجی صاحب ترنگزئی کے جہادی جھنڈے تلے لڑنے بونیر آئے تھے۔ البتہ اسکا خاندانی حجرہ اور جماعت ریگا میں موجود تھی۔ اسلئے انگریزوں نے اچانک حملہ کرکے اسکے حجرہ اور مسجد کو آگ لگادی اور فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ واضح رہے کہ سرتور فقیر اور حاجی صاحب دونوں ہڈے ملا کے مرید تھے۔

ایک شاعر نے جنگ رستم کا نقشہ ایک نظم کی شکل میں قلمبند کیا ہے موقعہ کی مناسبت سے ان کے چند اشعار یوں ہیں۔

بونیر و کڑلہ جمع غوگ کیدی لے عالمہ

دعائے پدے وکڑہ چہ عالم ترنہ جدا شو پا مخکے ئے ریگا شو

1) ور کوز شو پہ اخلاص، وھی سر د خناس

منگول د پیر بابا بہ پرے پراتہ وی شامدام جنگ جوڑ شو د اسلام

2) پہ کندہ کے راگیر شو غازیان ترنہ چاپیر شو

3) وار تیر د زیڑو گلو گولئی پہ سرو گلونو وریدے لکہ باران عالم شو حق حیران

4) حضرت میر، کریم شاہ دواڑہ ورتلل پہ لکہ غاڑہ

حسار شو د قلعہ خوا کے پراتہ وو لوئے اللہ تہ

5) پراتہ پہ بیابان ھغہ ملك شو پرے روخان

کوؤ بہ ئے ارمان چہ بندیوان شو د جنگریز بونیر ور کوز شو تیز

6) حاجی بابا وے زمہ نور دلتہ نہ کینمہ

زما پہ برخہ جوڑ سفر شو بونیر واڑہ کسکر شو

قبائلی دور اور ڈلہ بازی

ارسطو فرماتے ہیں کہ انسان معاشرتی حیوان ہے انسانوں میں رہنا معاشرے سے اپنی ضروریات پوری کرنا معاشرے کے افراد سے گھل ملنا، ان کا ساتھ دینا اور ان سے مدد حاصل کرنا اسکی مجبوری ہوتی ہے۔ معاشرہ افراد کا مجموعہ ہے لیکن یہی معاشرہ جب ایک منظم شکل میں ہو۔ اور ایک ضابطے اور قانون کے پاسداری کی روشنی میں سفر کرتا ہے۔ تو وہ انسانوں کے درمیان حقوق وفرائض کا میزان قائم رکھتا ہے۔ اور معاشرے میں جنم لینے والی محرومیاں اور برائیاں سرخم کر دیتی ہے۔ لیکن جہاں معاشرے کے افراد شتر بے مہار اپنی مرضی کی زندگی گزارتے ہیں وہاں معاش، سیاسی اخلاقی اور اقتصادی توازن بگڑ جاتی ہے۔ اور پھر جسکی لاٹھی اسکی بھینس والی مثال غضب کی آنکھ وا کر کے غریب طبقہ رگڑا اور روندھا جاتا ہے۔ پھر معاشرے کے وڈیرے، سردار، ملک اور خوانین جونک کیطرح پسے ہوئے طبقے کے خون چوستے نہیں تھکتے ہیں۔ معاشرہ دو حصوں میں بٹ کر دو بڑے لارڈز کے ہاتھوں میں ناچتا رہتا ہے۔ دونوں طرف کی بندوقیں اور اسلحے ان پسماندہ اور کمزور لوگوں کے شانوں پر پڑ کر انہیں اپنے ہاتھوں خون میں نہلانا پڑتا ہے اور بادار سرمایہ دار، خوانین اور وڈیرے دور تماشا دیکھ کر اپنی جنت کو دوسروں کی لہو سے چمکانے کے منتظر رہتے ہیں۔

زور وزر، جاگیر سرمائے اور طاقت وقوت کی یہ جنگ دنیا کے کونے کونے میں مختلف رنگوں اور مختلف شکلوں میں چلی آرہی ہے۔ اور اسکی بل بوتے پر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ نے دنیا کے بیشتر علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر کے دنیا کو تحلیل کرتے ہوئے نوآبادیات میں تقسیم کیا تھا۔

آخر مال وزر کے اس جنگ سے تنگ آکر بعض پسماندہ اور کمزور طبقے سر بکف میدان جنگ میں کود پڑے مسولینی، ہٹلر، ماوزے تنگ، اور کمال سنگ وغیرہ عمل کے میدان میں کود پڑیں اور اپنے قوم کو پسماندگی کی دلدل سے نکال کر دم لیا۔

دنیا کے بیشتر ممالک یورپ کے شکنجے سے آزاد ہوئیں۔ جمہوریتیں بنیں، مختلف سماجی اور اقتصادی نظاموں کا سہارا لیا گیا۔ لیکن سرمایہ داروں، جاگیرداروں، صنعت کاروں اور بے زمین ہاریوں اور بے سروسامان شہریوں کے درمیان یہ جنگ اور کش مکش ختم نہیں ہوئی اور آج تک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ ریاستوں کی وجود اور منظم شکل میں حیات انسانی کی ارتقاء سے پہلے زور اور قوت جسمانی اور افرادی طاقت تھی پھر صاحب ثروت اور امراء کے بلا انتخاب اور ضابطے کی قید و بند سے آزاد نشۂ حکمرانی کا دور چلا جس کو چاہتا سولی پر چڑھاتا، اپنے بالا خانے اور دیوان خانے میں لٹکاتا اور بعض کو اپنا ناظر اور ڈنڈا بردار کا شرف بخشتا۔

موجودہ دور میں بھی یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر جتنی بھی اسائش اور مہربانیاں ہیں۔ وہ صرف اور صرف ان صاحبان کو زیب دیتی ہیں۔ جو ملک کے بست و کشاد اور پاسبان ہوتے ہیں۔ غریب بے چارے کو دو وقت کی روٹی ملنا بہشت بریں سے کم نہیں ہوتا ہے۔ پاسبانان وطن اور قائدین کشور کی کونسی کرتوت اور افعال ہیں۔ جو اس قبائلی بے آئین اور بے جوڑ نظام سے کم درجے کے ہیں۔

ہم آج بھی وہی کھڑے ہیں جہاں ہم سو سال پہلے ہوا کرتے تھے۔ بلکہ اُس مقام کو بھی کھو چکے ہیں۔ اسلئے کہ اُس دور کے سینکڑوں سماجی اوصاف سے ہم ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

وہ دور جس میں ہمارے اسلاف رہ چکے ہیں۔ اور جسے حرف عام میں پشتو دور یا قبائلی دور کہا جاتا ہے۔ اُس کا دورانیہ شمالی علاقہ جات پر بہت طویل گزرا ہے اسکی وجہ یہاں کے لوگوں نے کبھی بیرونی غلامی کو زیب گلو نہیں ہونے دیا ہے۔ اُنکے شب و روز یا تو آپس کے ناچاقیوں میں گزرے ہیں اور یا سیکھ انگریز دشمنی میں انکی شمشیریں میدان جنگ میں گردن زنی اور قتل و غارت میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔

یہ کیسا دور تھا؟ کب سے شروع تھا؟ اور کب ختم ہوا حالات و واقعات اور تاریخی تناظر میں دیکھا جائے اور قبائلی نظام پر روشنی ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایسا دور تھا جس میں قانون اور آئین

معاشرے کے ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری، قول اور وراثت تھی۔ ایسا معاشرہ جسکی مہار پورے علاقے میں ایک یا دو ہاتھوں میں کھیل رہی تھی۔

یہ ایک طرح کا پسماندہ طبقے کا استحصالی دور تھا۔ یہ کسی ایسے قانون اور آئین کا روادار نہ تھا۔ جسمیں سزا و جزا کا عمل بلا امتیاز مساوات کی فضا قائم کرتا۔

بس تلوار، نیزہ، کمان، غلیل اور گوپن کشی اور تیر اندازی قوت و طاقت کا معیاری ترازو تھا۔

بیان بالا کے علاوہ اگر حال کے دریچوں میں اس دور کی باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو اسکی بے شمار مثبت پہلوؤں بھی منظر عام پر پائے جا سکتے ہیں۔

اس کے اختتام اور اغاز کے بارے میں ممتاز محقق محمد پرویش شاہین لکھتے ہیں۔

"سرزمین سوات میں یوسف زئی آمد سے لیکر 1892 تک ایسی کوئی حکومت قائم نہیں رہی۔ جسکو صحیح معنوں میں حکومت کا نام دیا جائے اور تو اور سرزمین سوات میں سیاسی وحدت ہوتی تو سکندر اعظم ایک ہی سوات میں مختلف مقامات اور مختلف راجاؤں کے ساتھ کیوں لڑتے"۔

سوات کے جغرافیائی وسعت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

" آج کا سوات قدیم وقتوں میں اپنی وسعت کے لحاظ سے اتنا سکڑا ہوا نہیں بلکہ پورے ملاکنڈ ڈویژن کو سوات ہی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جس کے مختلف علاقوں میں مختلف چھوٹے چھوٹے صدر مقام بھی تھے جن میں سے ایک صدر مقام تلی۔ لویا داریل کوہستان میں واقع تھا۔ کیونکہ بالائی علاقوں چین اور تبت کے ساتھ سوات کے تجارتی مراسم تھے اور ان دو/2 ممالک کے ساتھ آپس میں سفراء کی تقرریاں بھی ہوا کرتی تھیں لیکن اس فطری حسن اور رعنائی کے علاوہ سوات قدیم وقتوں سے اندرونی طور پر ایک خودمختار علاقہ بھی رہا ہے۔ جو معاشی، سیاسی، سماجی اور زراعتی طور پر خودکفیل تھا۔ کیونکہ اگر ایک طرف یہ قدیم شاہراہ ریشم پر واقع تھا۔ جہاں چین، روس، ہندوستان اور وسطی ایشیا سے تجارتی کاروان آیا کرتے تھے۔ تو دوسری طرف اسکی زمین نہایت زرخیز تھی۔ کھیت کھلیان بھرے ہوئے تھے جنگلات اور وافر پانی تھا اور پہاڑ سبزے سے بھرے ہوئے تھے۔ مختلف قسم کے مشروم اور ساگ ان پہاڑوں میں اگتے تھے۔ موسم اور آب و ہوا خوشگوار اور افرادی قوت بے پناہ صلاحیتوں کی

حامل تھی'' (ماخوذ شعور سوات ماہ نامہ اگست 2010)

سینکڑوں سالوں پر محیط اس دور نے سوات بونیر اور شانگلہ کے اضلاع پر سن یاس سے سن بلوغت اور پیرانہ سالی کا طویل دورانیہ گذارا ہے اور بیسویں صدی کے شروع میں مذکورہ علاقے شخصی ضابطے اور پھر سیاسی دھارے میں آکر باقاعدہ حکومت کا حصہ بنے ہیں۔ خیبر پختونخواہ کے دوسرے شمالی علاقہ جات کیطرح چغرزئی کی بھی بڑے عرصے تک شبانہ روز قبائلی دور میں گزر چکی ہے۔

ہر وقت طبلِ جنگ گرم رہتا۔ قبائلی صفیں تیار، تلوار تانت اور تیر کمان سے باہر تھے۔ تپہ جات اور دیہاتوں کے درمیان ہر وقت محاذ ارائی جاری رہتی۔ بچوں کے کھیل بھی ایک طرح سے میدان جنگ ہوا کرتی۔ اس میں سنگبازی، گوپن بازی اور پکڑ دھکڑ کا سخت مقابلہ اور شہ زوری شامل ہوتی۔ جنکے نتائج عموماً خون خرابہ، مار دھاڑ اور قتل و غارت پر منتج ہوتی تھیں۔ ہر علاقہ اور طبقہ خوانین کے زیر نگین ہوتا تھا۔

علاقے کے لوگ بلا تنخواہ اُنکے ڈنڈا بردار فوج تھی۔ علم لوگوں کے زندگی دونوں ڈلوں میں سے کسی ایک کے لئے وقف تھی۔ اسکی عوض اُنہیں ایک طرح مضبوط سہارا بھی حاصل ہوتا تھا۔ ڈے کا خان اپنے ڈلہ کے ہر فرد کے ہر اچھے برے میں شریک ہوتا تھا اور اس حوالے سے پھر وہ نسب برادری اور رشتہ داری کا قائل نہ تھا۔ معاشرے میں بعض باتوں میں کسی حد تک توازن، سماجی زنجیر اور تسلسل قائم تھا۔ اس دور میں مستقل ویش کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اور نہ کسی کا مستقل رہائش ور ہائش ٹھکانہ تھا۔ ہر وقت یہی خانہ بدوش پناہ گاہ کی تلاش اور دشمن سے لڑنے کی تدبیروں میں سرگرداں رہتے تھے۔ 1915ء سے پہلے کا زمانہ جبکہ سوات میں کوئی حکومت یا حاکمانہ قوت نہیں تھی۔ اس خودسرانہ قبائلی دور کو پشتو کا زمانہ کہتے ہیں۔

لیکن پشتو دور کی اپنی خوبیاں بھی تھیں یہ شجاعت، جوانمردی، غیرت اور سچائی وصداقت پر مبنی دور تھا۔ ہاتھی سے [illegible] کھانے کے اور اور دکھانے کے اور والا معاملہ نہیں تھا۔ ہر معاملہ میں راست گوئی وفاداری اور خودی وخودداری کا معیار قائم تھا۔ دوستی اور دشمنی کا معیار واضح تھا۔

آصف خان پشتو کی مفہوم اور اس دور کے خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

پشتو اس شجاعت اور غیور جذبے اور قومی آئین کا بھی نام ہے۔ جسکی وجہ سے افغان اقوام عالم میں ایک شجاع، فیاض اور غیور قوم کی حیثیت سے متعارف ہے۔ یہی پشتو گویا مجموعہ ہے ان اوصاف کا یعنی مہمانوازی، فیاضی، شجاعت، کمزور کی دستگیری، قومی ناموس پر نچھاور ہونا، دین کے لئے کٹ مرنا، قول واقرار کی پابندی، صاف گوئی اور اظہار حق کی حمایت کرنا، دوسروں کو پناہ دینا خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، میدان جنگ میں ڈٹ کر لڑنا، قومی اتحاد سے وابسطہ رہنا، اپنے شرم اور ناموس پر کٹ مرنا، اپنے جائز حقوق کو حاصل کرنا۔ نیز اس قسم کی دوسری قابل فخر روایات اور اوصاف کی پابندی جس دستور اور جزبے کی تحت کی جاتی ہے۔ اسکو بھی پشتو یا پختو کہتے ہیں۔ پٹھان قوم کے ہر قبیلے میں جب کوئی کسی کو طعنہ دیتے ہیں تو یہی کہتے ہیں۔ کہ تم میں پختو نہیں ہے۔ اور اسی مناسبت سے بھی قبائلی دور کو پشتو دور کہا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں مسلسل افراتفری اور بعض استعماری قوتوں کے مسلط ہونے کی وجہ سے سوات کی حالت پشتو زمانے میں ایسی نہ رہی جس قسم کے دستوری اوصاف سے مزین زندگی کا ہم ذکر کر چکے ہیں''۔

اس قبائلی دور میں سوات بونیر اور شانگلہ اندرونی اور بیرونی طور پر دو حصوں میں تقسیم تھے اور دونوں کے درمیان امن اور جنگ دونوں صورتوں میں روابط قائم تھے۔ بوقت ضرورت وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ یہ ڈلے علاقائی سطح پر مقامی خوانین اور قومی سطح پر قومی ہیروز کے حکم کے منتظر ہوتے تھے۔ یہ ڈلے اور دھڑے مختلف اوقات میں مختلف ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔ آج بھی بوڑھے بزرگوں کے مابین پشتو دور کی جنگوں اور ڈلوں کے بارے میں بہت سے قصے سننے کو ملتے ہیں۔ یہ ڈلے خدین خیل اور یاں خیل کے ناموں سے معروف ہیں۔ انہیں کوزہ ڈلہ اور برہ ڈلہ بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح باچا ڈلہ اور تنول ڈلہ اور عزی خیلہ ڈلہ اور بابوزوالہ ڈلہ انکے مختلف نام ہیں۔ عزی خیلہ ڈلہ ریاست مخالف ڈلہ تھا اسے برہ ڈلہ بھی کہا جاتا ہے۔ بونیر میں اسکا مرکزی مقام ایلئ تھا۔ اور اس ڈلے کی قیادت بابوزے ملک کور کرتے تھے۔ چغرزئی میں اسکے ہمنواؤں میں فضل الرحمٰن خان بیخانئ، گلونو باوڑی کے آلہ یار خان اور نانگوڑہ کے پسند خان معتبر خوانین اور ریاست کے مخالفین میں سے تھے۔

وادی چغرزئی کے علاوہ عزی خیلہ ڈلہ میں بونیر کے زرین خان (کلپانئی) مارتونگ کے محمد اسلام اور سوات کے معروف خان افضل خان لالا شامل تھے۔ اسی طرح چکیسر بھی عزی خیلہ ڈلہ کا مضبوط گڑھ اور باچا مخالف سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔

دوسرا ڈلہ بابوزوالہ ڈلہ یا کوزہ ڈلہ کہلاتی ہے۔ اسے بادشاہ صاحب اور بعد میں ریاست کی پشت پناہی حاصل تھی ایلئی بونیر کا غوری لعلی خیل اس ڈلے کا روح رواں اور نگران تھے۔ سوات میں اس ڈلہ میں شامل شیر محمد خان تھے۔ جو ریاست دور میں وزیر مال رہ چکے ہیں۔ بونیر میں باجکٹہ کے خان سعید اللہ خان ریاستی دور کے بانی اکابرین میں رہے ہیں۔ اسے ریاست کی طرف سے بہادری کا لقب ''خان بہادر'' ہونے کا اعزاز ملا ہے۔ اور آپ اور آپ کی ساتھیوں کی قربانیوں سے بونیر ریاست کی عملداری میں آیا ہے۔ وادی چغرزئی میں ریاست حمایتی اکابرین اور خوانین میں ناصر بابا (گنبت) عمرا خان بابا (شمنال) اور غلام حیدر بابا (ٹوپئی) چوٹی کے خوانین میں سے تھے۔ ناصر بابا کے بعد اس کے خاندان میں امبارا خان عرف تورخان اس کے ہمنوا رہے۔

مذکورہ بالا ڈلے اور گروہ بندیاں ریاست سوات کے پاکستان میں انضمام پر بڑے حصوں مسلم لیگ اور ANP میں تقسیم ہوئے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیاست میں حرف آخر نہیں کے مصداق اُن کے متوالوں پر بھی موجودہ سیاست کا جادو چڑھ آیا۔ اُن میں بعض نے بے شمار رنگ بدلے ہیں۔ آج کل اُن اکابرین کی اولاد مختلف سیاسی بندھنوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ماضی کے بہت سے حریف آج ایک پلیٹ فارم پر جمع حلیف بنے ہوئے ہیں۔ اور آج کی تناظر میں انکی ماضی کی تصویر دھندلکوں کا شکار ہو کر آسانی سے اسکا کھوج نہیں لگایا جا سکتا ہے۔

ماضی میں مرکزی سطح پر اعلیٰ قائدین ایلئی اور مقامی سطح پر گنبت، ناگوڑہ، بیخائی اور شمنال وغیرہ کے خوانین دو مخالف ڈلوں کے مضبوط بازو تصور کیے جاتے تھے۔ ہر وقت آپس میں دست وگریبان اور صف اراء تھے۔ اور ضرورت پڑنے پر بونیر سے کمزور ڈلہ کا حمایتی لشکر بروقت پہنچ کر مخالف ڈلہ کے لشکر پر حملہ اور ہوتا۔ اور اسے دشمن کے پنجے سے آزاد کرا کر واپس چلا جاتا ایک لشکر جب مقامی لشکر پر آ دھمکتا تو اسے مقامی بولی میں ''دھاڑا'' کہا جاتا تھا۔ لشکروں کے اپنے اپنے نشان

تھے انہیں نشان بردار آگے لے جاتا اور ہر صورت میں اسے مستحکم اور تھامے رکھتا کیونکہ علم گرنے اور بلند ہونے کے ساتھ فتح وشکست کی تقدیریں وابسطہ تھیں۔ اس دور کے لوگ پکے نشانہ باز تھے اس جنگ کے دوران وہ بہت سفاک اور پتھر دل کے مالک لوگ تھے۔ دوران دھاڑا لفظ معافی اُنکی کتاب میں نہیں ہوتا تھا۔ جب کوئی لشکر شکست کھاتا تو وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلنے میں عافیت سمجھتا۔

یوں غالب لشکر آ کر اُنکے گھروں کو آگ لگا کر خاکستر کر دیتا اور اُنکے تیار فصلوں کو گاجر مولی کیطرح کاٹ ڈالتا۔ اس دور میں اگر ایک طرف میدان کارزار گرم رہتا تو دوسری طرف وہ روایتی ٹیکنالوجی کے ایسے رسیا اور ماہر بھی تھے۔ کہ ہر حالت میں اپنے جان و مال کی حفاظت کے گر جانتے تھے۔ ہر گاؤں میں دفاعی بُرج موجود تھا۔ اس میں چوکس دستہ ہر لمحہ تیار پہرہ دیتا۔ یہ بُرج بعض دیہاتوں میں 40,35 فٹ تک بُلند تعمیر ہوتے تھے۔ گھروں میں املاک کو بچانے کی خاطر اُن لوگوں میں ماہرانہ بیداری اور ہنرمندی کی کمی بھی نہیں تھی۔

وہ گھروں میں گہرے کھڈے کھود ڈالتے اور بوقت ایمرجنسی بڑی سرعت اور چابکدستی کے ساتھ ان کھڈوں میں گھر کے سارے ساز وسامان اور غلہ وغیرہ دفن کر کے اس پر مچکن کے بڑے بڑے پاٹ رکھ کر ان کے سروں کو مٹی سے لیپ کرتے اور شرونی (ہجرت والے) مدت کے اختتام پر واپس آ کر باہر نکالتے۔ یہ حملے اکثر اچانک ہوا کرتے تھے۔ البتہ جب ایک ڈلہ مخالف پر ہلہ بولنے کا ارادہ کرتا اور مخالف ڈلہ کو کسی طریقے سے اُنکے طیور کا پتہ چل جاتا۔ تو حفظ ماتقدم کے تحت دشمن کے حملے کو ناکام بنا کر حملہ اور کو پسپا ہونے پر مجبور کرتا۔ اس طریقے سے دشمن کے حملے کو ناکام بنانے کے عمل کو مقامی زبان میں ''دھاڑہ'' پیازہ شوہ (یعنی دھاڑ کی حکمت عملی ناکام رہی) کہا جاتا اس دور میں ہر گاؤں کے گرد جنگلی گلاب کے کانٹے دار جھاڑیوں کا ایک باڑ چاروں طرف باندھ لیا جاتا تھا۔ باڑ کے علاوہ گاؤں کی حفاظت اور حملہ اور کے حملہ کو نشانہ بنانے کے خاطر ایک بڑی بُرج کی تعمیر بھی کی جاتی تھی۔

واضح رہے کہ گاؤں کے گرد باڑ اور خندق کی کھدائی کا یہ دستور آج سے نہیں بلکہ ہزاروں

سال پہلے آرین کی حکمت عملی اور دیہاتی ٹیکنالوجی ہے اور اس سے یہاں کے لوگوں کی آرین سے تعلق کی دلیل اور آرین کی یہ اولین اقامت گاہوں میں سے ایک کی ثبوت فراہم ہوتی ہے۔

چغرزئی کے سینے پر پشتو دور کے قبائلی ایسے رزمیہ سینکڑوں داستان رقم ہیں۔ جس سے جداگانہ ضخیم کتاب رقم ہوسکتی ہے۔ یہاں صرف ان میں ایک دو پر تھوڑی بہت تبصرہ ہماری اس بحث پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ پشتو دور میں یہاں کے خوانین بھی دو مختلف دھڑوں میں تقسیم تھی۔ اُنکی پارٹی وابستگی اور وفاداری عزی خیل اور بابوز والہ ڈلوں سے باندھی ہوئی تھی۔ اور دونوں کے قومی ہیڈ کوارٹر بونیر میں ایلئی چلے آرہے تھے۔ لیکن دونوں کے لشکری قوت کے تانے بانے اور استحکام دولت زئی کے خوانین کی لشکر تھیں۔ وہ ہر اڑے وقت میں اپنے ڈلوں کے دامے درمے سخنے مدد کرنے آتے تھے۔ چغرزئی کے دیہاتوں اور املاک نے کئی بار بھڑکتے شعلے اور آلاؤ دیکھے ہیں۔ مخالف لشکر کے ہاتھوں یہاں کے درودیار سے سینکڑوں جنازے نکلے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ تپہ مدتخیل کا جرگہ ہو رہا تھا۔ شخالہ خیل کے ذیلی شاخ نظر خیل نے جرگہ پر ہلہ بول کر جرگے کے سولہ افراد کو بے خبری میں موت کے نیند سلا دیئے چونکہ پشتونوں کے میدان جنگ ہر وقت گرم، اُنکے تلواریں میان سے باہر اور تیر ترکش سے نکالے گئے ہوتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اُنکا پنچایتی اور جرگہ سسٹم بھی قابل دید ہے۔ آپس میں خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ اور لوہے سے سخت ہوتے ہیں۔ لیکن جرگے کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور موم میں تبدیل ہونے کے اوصاف بھی رکھتے ہیں۔ اور جب پشتونوں میں کوئی جرگے کی توہین کا ارتکاب کریں تو پھر اسے اس نظام کا تلخ گھونٹ حلق سے ضرور اُتارنا پڑتا ہے۔ جرگہ فیصلہ اور رسم علاقہ کے تحت مجرم قبیلے نے ہجرت کر کے مانسہرہ ایبٹ آباد وغیرہ میں چلے گئے اور وہاں ہو کے رہ گئے۔

کہتے ہیں کہ پشتو دور میں ٹانگوڑہ تپہ شخالہ خیل اور گنبت کے مدتخیل کے درمیان کبھی نہیں بنتی تھی معمولی معمولی فروعی مسائل اُنکے درمیان وجہ نزاع بنتے تھے۔ دوسرے تپہ جات کیطرح مذکورہ قبیلوں کے درمیان توری ران (مستقل) ویش نہیں ہوا تھا۔

اُس وقت گنبت کے مسند خانی پر صابر خان بابا بُراجمان تھے اور اسکا حریف پسند خان بابا ٹانگوڑہ کے بے تاج بادشاہ تھے گنبت قدیم زمانے سے قلعہ بند آبادی تھی۔ اسکو داخل ہونے کیلئے تین گیٹ تھے اور ہر گیٹ پر حفاظتی بُرج کھڑی تھی۔ جس میں چوکیدار پہرہ دیتا تھا۔

کہا جاتا تھا کہ ایک دفعہ مدتخیل اور شخالہ خیل کے درمیان زمینی تنازعہ پیدا ہوا مدتخیل شخالہ خیل کی زمین پر زبردستی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ جبکہ شخالہ خیل کی قیادت اس کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ اس وقت شخالہ خیل کی قیادت پسند خان بابا کا چچا سعداللہ خان بابا کر رہا تھا۔ صابر خان قلعہ میں محصور تھے اسکے ساتھ عمرا خان بابا اور دوسرے ساتھی بھی قید تھے۔ دوسری طرف سعیداللہ بابا کے کمک کیلئے بونیر سے مختلف تپہ جات پر مشتمل دستہ جنگی قیادت کلپانی کے صدیق بابا اور مدد بابا کر رہے تھے حاضر تھے۔ فرقین کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ دونوں طرف کے قبائل اپنی پوری قوت بازو کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اتنے میں صابر خان بابا کے ملاتڑوں نے جنوبی برج سے سعداللہ خان بابا پر پتھر کلہ نامی بندوق سے فائر کر کے صابر خان بابا اور اسکے ساتھیوں کی جان چھڑا کر آزاد ہو گئے۔ اسی اثناء میں سعداللہ خان بابا برج میں موجود ملاتڑوں میں سے ایک ملاتڑ کے پتھر کلے کے گولے کے زد میں آکر گر گئے اور زندگی کے بازی ہار کر وفات پا گئے۔

یہ عام اُصول اور قاعدہ ہے کہ بہادر حریفوں سے مقابلے اور قتل مقاتلے میں پشتون قوم کو ایک قسم مٹھاس محسوس ہوتا ہے۔ ساری کی ساری آن بان اور شان وشوکت ان بہادر سورماؤں اور کمانڈروں کی مرہون منت ہوا کرتی ہیں۔ اسلئے تو ماضی میں ایسے شہسواروں اور شہ زوروں کی موت نہ صرف اپنے پسماندہ گان اور قبیلے کیلئے بڑا سانحہ ہوتا تھا بلکہ اسکے جانی دشمن کیلئے دکھ اور پریشانی کا باعث ہوتا تھا۔ کیونکہ اسی طرح کے سانحوں اور حادثات سے ان قبائل کی اجتماعی ساکھ اور مشترکہ سرحدات بھی دفاعی لحاظ سے کمزور ہو سکتے تھے۔

پشتون ہمیشہ بہادر دشمن پر فخر کرتے ہیں۔ اور کمینہ بے غیرت کے ہاتھوں موت سے ہمیشہ پناہ مانگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بے غیرت دوست سے بہادر دشمن ہزار بابہتر ہوتا ہے۔ اسلئے تو جب ناصر خان بابا اور دوسرے خوانین کو سعداللہ خان بابا کی [illegible] کے ہاتھوں شہادت کی خبر پہنچی تو وہ

بہت زیادہ نڈھال و پریشان ہوگئے اور ملاتڑوں کو بلا کر انکی خوب سرزنش کی اور یہ اسلئے کہ وہ ایسے ہیرو کو ملاتڑوں کے ہاتھوں سکرین سے ہٹا کر موت کی گھاٹ اُتارنا کسی قدر گوارا نہیں کرتے تھے۔

چغرزئی کے مٹی پر لڑنے والی پشتو دور کی یہ آخری لڑائی مانی جاتی ہے۔ اسکے بعد ریاست وجود میں آئی اور اسکے ساتھ توری ران ویش وجود میں آکر لوگ مستقل ٹھکانوں اور جائیداد کے مالک بن گئے۔

پشتو دور باقاعدہ سیاسی وحدت میں بدلنے اور ریاست میں ضم ہونے کے حوالے سے سوات، بونیر علاقہ خدوخیل اور چغرزئی میں اسکا خاتمہ مختلف وقتوں اور تاریخوں میں ظہور پزیر ہونا نظر آتا ہے۔

سوات میں یہ دور 1917 بونیر میں 1923، خدوخیل میں 1924 کے اخری مہینوں اور علاقہ چغرزئی میں 1923 کو اختتام کو پہنچا۔ یہاں باقاعدہ ریاست قائم ہوئی۔ اور مذکورہ علاقے سابق ریاست سوات کے عملداری میں شامل ہوکر پشتو دور کا خاتمہ ہوا۔

ریاست سوات میں ادغام

1923ء سے پہلے وادی چغرزئی بشمول بونیر آزاد قبائلی دور کا جہاندیدہ رہا ہے۔ اس دور میں لوگ کسی ضابطے اور آئین کے روادار نہیں تھے۔ معاشرہ دو مختلف دھڑوں میں تقسیم تھا ہر دھڑے کے لوگوں کے حاکم اور حکمران اُنکے گاؤں کا طاقتور خان اور ملک ہوتا تھا۔

البتہ عام لوگوں اور امراء میں وعدے کی پابندی، بلا کے مہمان نوازی اور شجاعت و دلیری اور راست گوہی کے اوصاف ضرور تھے اس دور میں بھی اس باوقار اور وفا شعار مٹی نے اپنے وہ اوصاف اور اقدار برقرار رکھے چلے آرہے ہیں۔

1917 میں ریاست سوات طویل جدوجہد اور اُتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد معرض وجود میں آئی۔ سربراہ ریاست نے عنان سلطنت سنبھالنے کے بعد سب سے پہلی توجہ اپنی سرحدات کی تحفظ اور حدود سلطنت بڑھانے کی طرف دی اسکے لئے اس نے کافی غور وخوض کے بعد ماضی کی دریچوں میں جھانکتے ہوئے مختلف علاقوں میں اپنے ہمنوا گروپوں کی تشکیل کیلئے دوڑ دھوپ کا آغاز کیا۔ اور بہت ہی قلیل عرصہ میں وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ہر علاقے سے مضبوط اور خاندانی لحاظ سے طاقتور ٹولہ آپکے ہاتھ آیا۔ اسی طرح سربراہ ریاست کی لشکری قوت اور قیادت میں ناقابل یقین حد تک اضافہ ہوا اسکے برعکس اسے معاشرے کے اس مضبوط دھڑے سے نبرد ازما بھی ہونا پڑا جو تینول کے دست و بازو بن کر کسی قدر ریاستی طوق کو گلے لگانے کیلئے تیار نہ تھے لیکن رفتہ رفتہ ریاستی لشکری قوت اور بے پناہ مقبولیت کے سامنے تینول کو آخر میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا گیا۔

جب ریاست سوات کے حکمران کی لشکری قوت اور جنگی طاقت کا گراف بڑھتا گیا اب اسے پتہ چلا کہ حالات اسکے کامیابی پر فتیح ہونے کیلئے سازگار ہیں اور اب وہ پوری قوت سے نواب آمب کی طاقت کو پارہ پارہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تو آپ نے مختلف علاقوں کو لشکر روانہ کیے

اور باری باری بونیر علاقہ خدوخیل، کانا، غور بند اور کوہستان تک کے علاقوں پر اپنا تسلط جما کر ریاست کے دائرہ اختیار میں شامل کردئے چغرزئی بہت وسیع اور بھاری زمینی رقبہ رکھنے والی وادی ہے۔ جو بیک وقت تین اضلاع کے طول وعرض پر پھیلی ہوئی ہے۔

1923 کے دوران میاں گل عبدالودود نے نہ صرف پورے وادی بونیر وچملہ کو قبضہ کیا۔ بلکہ عملی طور پر سوات اور بونیر کے قبیلوں نے سوات اور دریائے سندھ کے درمیان تمام علاقے کو فتح کیا اس فتح کی خوشی میں باچا صاحب نے 8 فروری 1924 کو ایک بڑے جشن کا اہتمام کیا۔ اپنے فوج کے کارکردگی کو سراہا انکے حوصلے بڑھائے، انہیں انعامات سے نوازا اور جنگ میں حصہ لینے والے پانچ میجروں کو کمان افیسر کے عہدوں پر ترقی دی اور دیگر فوجیوں کو میجروں کے عہدوں سے سرفراز کیا گیا۔

دسمبر 1923 میں میاں گل عبدالودود نے مارتونگ جوبئی خیل اور نصرت خیل قبیلوں نے قبضہ کیا تھا۔ پر لشکر کشی کر کے دوبارہ قبضہ کیا اور دریائے سندھ تک کے کناروں تک ملک کو روند ڈالا۔

سوات بونیر، علاقہ خدوخیل اور چغرزئی علاقے کی انتظامی امور کی انجام دہی اور دفاعی استحکام کی خاطر جہاں مناسب اور ضروری سمجھا قلعوں تحصیلوں اور پولیس چوکیوں کی تعمیر عمل میں لائی گئی اور وہاں ریاست کی مشنری نے اپنا کام شروع کیا۔

اس مقصد کیلئے آپ نے سب سے پہلے ریاستی انتظامی ڈھانچے کو چند حصوں میں تقسیم کیا۔ چار ہزار مربع میل اور سات لاکھ آبادی کو انتظامی لحاظ سے تین بڑے حصوں سوات بونیر اور کوہستان میں تقسیم کیا۔ اور انہیں مزید 33 تحصیلوں میں تقسیم کر کے 10 حاکموں کے زیر نگین مقرر کردیئے گئے۔ ریاست میں حکیمی کے مقامات بریکوٹ، بابوزئی، کبل، مٹہ، خوازہ خیلہ، بحرین، چکیسر، پٹن، ڈگر اور طوطالئی خدوخیل قرار پائے گئے۔

ڈگر کو ضلع بونیر کے دارالخلافہ کا مقام ملا۔ اور پوری ریاست کی ذیلی تحصیل کی حیثیت سے پہچاننے لگے زمینی وسعت کے پیش نظر انتظامی اور عدالتی امور کی آسانی سے سنبھالنے کے لئے ڈگر اور طوطالئی کو حکیمی کے مقامات مقرر کئے گئے۔

ریاست سوات میں جہاں دوسرے علاقوں میں تحصیلوں پولیس چوکیوں اور قلعہ جات کی تعمیر کی گئی تھیں چغرزئی میں بھی مختلف مقامات پر قلعہ جات اور چوکیاں قائم کیں۔ مراد وہائی سکول سے ملحقہ ریاست کا قلعہ تھا۔ جو اونچائی پر واقع ہونے کی وجہ سے سرقلعہ کے نام سے مشہور تھا۔ میرہ گئی میں تھانہ کی تعمیر کی گئی تھی۔ جو بنج تھانہ کے نام سے مشہور تھا۔ بانگیڑے اور بدال کے مقام پر ریاستی چوکیاں قائم تھیں۔ گلبانڈئی کے مقام پر تحصیل کی تعمیر کی گئی تھی۔ اور اسے سارے چغرزئی کی سطح پر ہیڈ کوارٹر کی حیثیت حاصل تھی۔

1969ء تک ضلع بونیر ریاست سوات کا مضبوط بازو رہا۔ 28 جولائی 1969 میں ریاست سوات کا ادغام پاکستان میں ہوا اور ریاست سوات کو حکومت پاکستان کی ضلع کی حیثیت مل گئی۔ ضلع بونیر ضلع سوات کا سب ڈویژن رہا۔ اور اسی طرح علاقہ چغرزئی کو بونیر سب ڈویژن کی ذیلی تحصیل قرار دے دی گئی۔

ریاستی دور، انتظامی یونٹس اور عمائدین علاقہ

چغرزئی انتظامی حوالے سے ضلع بونیر کا زیر کنٹرول علاقہ اور سب تحصیل ہے جو کہ 2009 تک ڈگر تھانہ کے زیر انتظام تھا لیکن 2010 میں جب صوبہ خیبر پختونخواہ نے انتظامی بوجھ کے پیش نظر اور حالات کی نزاکت کی روشنی میں ضلع بونیر کے تحصیلوں اور پولیس تھانوں کی تعداد بڑھانے کی منظوری دے دی تو علاقہ چغرزئی کو پولیس سٹیشن ڈگر کے بجائے گلبانڈئی تھانہ کا زیر انتظام علاقہ قرار دیا گیا۔ اسکے علاوہ چغرزئی کے مختلف مقامات پر انتظامی امور کے انجام دہی کیلئے چھوٹی چھوٹی ذیلی یونٹس بھی کام کر رہی ہیں جو تھانہ گشتی چوکیاں اور چوکیاں کہلاتی ہیں۔

یہ انتظامی یونٹس بٹاڑہ، شہیدے سر اور بانگیڑے اور بدال میں قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں بدال کو تھانہ کی حیثیت حاصل ہے اور ASI کے زیر نگران ہیں۔ اور باقی چوکیاں ہیں۔

ریاست کے دور میں امن عامہ کو برقرار رکھنے اور انتظامی امور کی انجام دہی کیلئے ریاست نے

ریاست کے اندر چوکیوں اور قلعہ جات کا جال بچھایا تھا۔ چوکیوں میں ریاست کی پولیس ڈیوٹیاں سرانجام دیتے تھے۔ چوکی کا سربراہ جمہ دار کہلاتا تھا۔

پوری ریاست 33 تحصیلوں پر مشتمل تھی۔ جن میں موجودہ ضلع بونیر کو تحصیل اور چغرزئی کو سب تحصیل کی حیثیت حاصل تھی۔ ریاست میں دوسرے مقامات کے ساتھ چغرزئی میں بھی مختلف مقامات پر قلعہ جات اور چوکیاں قائم تھیں۔ چغرزئی میں مرادو ہائی سکول سے ملحقہ قلعہ کی تعمیر کی گئی تھی۔ جو سر قلعہ کے نام سے مشہور تھا۔ میرہ گئی کے قریب تھانے کی تعمیر بنج تھانہ کے نام سے کیا گیا تھا اور میرہ گئی کے تاج محمد خان جمہ دار کے زیر نگرانی چل رہا تھا۔ بانگیڑے اور بدال کے مقامات پر پولیس چوکیاں قائم تھیں۔ گلبانڈئی کو مرکزی مقام حاصل تھا کیونکہ یہاں ریاست کی سب تحصیل واقع تھی۔ اور تحصیلدار اس کا سربراہ ہوا کرتا تھا۔ پولیس اور جمہ دار اسکا انتظامی عملہ تھا۔ جبکہ قلعہ میں حولدار اور اُسکی نفری تعینات تھی۔ نفری کی تعداد تقریباً 50 تک تھی۔ آج قلعہ کی عمارت انسانی بھیڑیوں کی بے رحم ضربوں اور خودغرضیوں نے دیمک کی طرح چاٹ لی ہے اور اب اسکی محض یادیں ہی یہاں کے بزرگوں کی سینوں میں زندہ ہیں اور اگر انہیں صفحہ ابیض پر نہیں لائے گئے تو کچھ زمانہ بعد قصہ پارینہ بن کر صفحہ دھر سے مٹ جائیں گے۔ ریاستی دور میں ایک پولیس اہلکار ''گھڑی'' میں رات کو پہرہ دیتا اور خبردار خبردار کا مسلسل آواز لگاتا جو اسکے ڈیوٹی کا مخصوص انداز اور طریقہ تھا۔ تحصیلدار کے ساتھ اسکا پرسنل سیکرٹری ہوتا تھا جو ریاستی زبان میں منشی یا مرزا کہلاتا تھا۔ مرزا کے علاوہ اسکے ساتھ قاضی بھی موجود ہوتا تھا۔ رواج کا فیصلہ تحصیلدار خود کرتا جبکہ قاضی شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ قاضیوں میں یہاں تعینات ریاست کا پہلا قاضی فضل حسین آف مرادو اور دوسرے قاضی ہونے کا شرف میخوخیہ کے محمد حسین کو حاصل ہے۔ اُنکے علاوہ مولوی عبدالحق ولد عبد الحکیم، شمس الحق ولد عبدالحکیم اور شمس القمر ولد محمد حسین آف میخوخیہ وقتاً فوقتاً ریاست کے قاضی ہوگزرے ہیں۔

تحصیل سے متصل ریاست کی جانب سے ڈسپنسری قائم تھی۔ اسکا انچارج کمپوڈر کہلاتا تھا۔ کونین، نمبردس اور مرہم پٹی ڈسپنسری کی بنیادی ادویات تھیں۔ OPD اور علاج معالجہ اور دوائی

ہر شہری کو مفت فراہم کی جاتی تھیں ریاست کے اہلکاروں، عہدہ داروں، ملکان اور منظور نظر لوگوں میں عمرا خان جمہ دار (میخوخیہ)، تاج محمد خان جمہ دار (میرہ گئی) عبدلحنان ملک (میخوخیہ) سعدل ملک کوٹوال، حاجی محمد خان میرہ گئی، فضل رحمٰن بیخانئی (خان بیخانئی) ملک قوت کا کا بازارکوٹ، ملک صابر کا کا اور سلطان اور احمد علی خان مرادو، وغیرہ نامی گرامی شخصیات اور مختلف عہدوں اور اعزازات کے مالک ہوگزرے ہیں۔ گنبت میں ریاست کے ملکان اور خوانین صابر خان اور اکرم خان تھے۔ اُنکے وفات پر مسند ملکی اور خانی کے وارث اُنکے اولاد بالترتیب نصیب روان خان، اور امبارا خان عرف تور خان رہے اور اُنکی وفات کے بعد صابر خان کے پوتوں میں حبیب الرحمٰن خان اور اسکا بھائی حضرت جناب مسند ملکی اور خانی پر براجمان رہے۔ آج کل تور خان کی اولاد میں محمد اقبال خان نامی گرامی شخصیات میں سے ہیں جو کہ موجودہ ضلعی زکواۃ کمیٹی کا چیرمین ہے اور اسکا بھائی گلبانڈی یونین کونسل کی نظامت سنبھالے ہوئے ANP کے پلیٹ فارم سے جیتا ہے۔

ریاستی دور کے خوانین میں بیخانئی، میرہ گئی اور گنبت کے خوانین میں آج بالترتیب عبدالرشید خان، اور شریف خان، تاج محمد خان اور مجاہد خان نامی گرامی شخصیات ہیں۔ واضح رہے کہ سورے یونین کونسل کا موجودہ منتخب ناظم مجاہد خان ہے جسکا تعلق میرہ گئی سے اور سیاسی وابستگی JUI سے ہے۔ اور اپنے سیاسی حلقہ میں رول ماڈل ادا کر رہے ہیں جبکہ اسکے ساتھ بازارکوٹ سے تعلق رکھنے والا ANP کے پلیٹ فارم سے منتخب نائب ناظم گل روز خان ہے اور علاقے میں خاندانی اور سیاسی اثر ورسوخ کا مالک ہے۔ اسی طرح ریاست کے دور میں ٹوپئی سے تعلق رکھنے والا سکندر خان باباز ور آور خان اور ملک ہوگزرے ہیں۔

برشمنال کا شرن خان جو کہ ریاست کے دور میں ملک اور جمہ دار ہوگزرے ہیں۔ آج بھی بقید حیات ہیں۔ آپکے بیٹوں میں شیر زمان خان پاکستان عوامی پارٹی کے بانی اراکین میں شمار کیے جاتے ہیں اور موجودہ بلدیاتی نظام میں ٹاؤن کمیٹی کا تحصیل ناظم ہے۔ ٹانگوڑہ میں پسند خان ریاست میں ملکی کی سند پر متمکن شاندار دور سے گزرا ہے۔

جنوری 1991 تادم تحریر

تقریباً تریالیس سال ضلع بونیر ریاست سوات کی سب ڈویژن رہی جسمیں علاقہ چغرزئی سب تحصیل کی حیثیت سے بونیر سب ڈویژن کا حصہ رہا۔ ریاست کے گھر میں علاقہ چغرزئی کا شمار منظور نظر اور زرخیز وادیوں میں ہوتا تھا۔ اسکے گھنے جنگلات رس بھرے میٹھے میوہ جات، پُرتبسم پھول، شفا بخش پودہ جات اور لدے پھدے فصلیں ہر وقت حکمران وقت کے توجہ کا مرکز رہے ہیں اسکی شہد، دیسی گھی، مال مویشی اور غذائی اجناس ریاست کی آمدنی میں مہمیز کا کردار ادا کرتی تھیں۔

مذکورہ چیزوں کے علاوہ والی ریاست کا مضبوط حمایتی ٹولہ یہاں موجود تھا۔ انہوں نے ریاست کی قیام میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا۔ اور انکے قربانیوں اور کوششوں سے یہاں ریاست کی رٹ قائم ہو چکی تھی۔ 1969ء میں دوسرے آزاد ریاستوں کی طرح ریاست سوات کی بھی آزادانہ حیثیت ختم ہو کر پاکستان میں مدغم ہوا اسے ضلع کا درجہ دیا گیا اور بونیر ضلع سوات کا سب ڈویژن ٹھہرا ساتھ ساتھ چغرزئی نے اپنی سابقہ حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے بونیر کی سب تحصیل ہی رہی۔ 31 دسمبر 1990 کو صوبہ خیبر پختونخواہ کے گورنر فدا محمد خان نے بونیر کو الگ ضلع کی حیثیت دینے کی منظوری کا اعلان کیا اور بونیر نے یکم جنوری 1991 سے نئی زندگی کا آغاز کر کے جداگانہ حیثیت سے پہچاننے لگا۔ انتظامی امور سنبھالنے کے پیش نظر ضلع بونیر کو چار پولیس سٹیشنوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ کافی عرصہ علاقہ چغرزئی ڈگر پولیس سٹیشن کے زیر انتظام علاقہ رہا۔ آخر 2010 میں حکومتی فرمان کے مطابق ڈگر پولیس سٹیشن کا انتظامی جم بڑھا کر دو حصوں ڈگر، گاگرہ اور گل بانڈی میں تقسیم کر دیا اور یوں چغرزئی پولیس سٹیشن گل بانڈی کا انتظامی علاقہ قرار پایا گیا۔

یہ اسلئے 1989 میں نفاذ شریعت کے نام سے ایک تحریک مولانا صوفی محمد صاحب کے زیر قیادت دیر میدان سے اُٹھی اور اس نے چند سالوں کے اندر اندر سارے لوگوں کی دلوں پر قبضہ

کیا۔ دیر میدان سے اُٹھنی والی یہ تحریک پوری سرعت کے ساتھ پھیل کر وادی سوات کے عوام کے دلوں پر ایسی چھا گئی کہ آن ہی آن میں ساری وادی سفید خرقوں اور سیاہ پگڑیوں میں ملبوس نظر آنے لگی جلسے جلوسوں اور تقاریر کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا یہاں تک کہ اسلحہ کی نمائش ہونے لگی۔ بائیں ہاتھ والی ڈرائیونگ کو حرام قرار دیا گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں اسلحہ بردار جیالے سڑکوں پر گشت کرتے دکھائے دینے لگے اور حکومتی رٹ ختم ہوئی حکومت کے نیم فوجی دستے بلائے گئے۔ حکومت کے سارے ادارے اور سرکاری املاک تحریک کے جانبازوں کے قبضے میں تھے۔ گرین چوک میں ہوٹل میں جھڑپ کے نتیجے میں پی پی پی کے MPA بھی قتل کر دئے گئے۔ اور یوں ساری فضا عجیب کیفیت سے دوچار ہونے لگی۔ صورت حال کی سنگینی جب تباہی کی نہج پر نظر آنے لگی تو صوفی محمد صاحب نے وقت کا ادراک کر کے خود حکومتی بیلی کاپٹر کے ذریعے محاذوں پر گئے اور اسی طرح وقتی طور پر حالات معمول پر آ گئے۔ لیکن تحریک کی سرگرمیوں میں تسلسل برقرار رہی وقت گزرتا گیا۔ تحریک نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ کبھی دھرنوں اور کبھی خاموش تبلیغ کے ساتھ تسلسل کی زنجیر پوری مالاکنڈ ڈویژن کے علاوہ افغانستان اور قبائلی علاقوں تک پھیلتی گئی۔ 2001 میں جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو صوفی محمد صاحب اپنے ہزاروں جیالوں کیساتھ پاک افغان کے بارڈر پر نمودار ہونے لگے۔ واپسی پر اسے گرفتار کر کے پرویز مشرف حکومت نے اسے ڈیرہ اسماعیل خان جیل میں قید کر دیا۔ پانچ سال وہ سلاخوں کے پیچھے رہے۔ اور اسکے تحریک کے کارکنان باہر اپنے مشن کی اشاعت میں پوری انہماک اور دلچسپی دکھاتے رہے۔ اسی اثناء میں وادی سوات میں امام ڈیری کے مقام پر مولانا فضل اللہ منظر عام پر آنے لگے۔ اور اُس نے اپنے مشن کا آغاز ایک مدرسے کی تعمیر سے کی۔ اس کے ساتھ آپ نے FM چینل کا ابتداء کر کے اسکے ذریعے عبرت اموز وعظ شروع کرتے ہوئے لوگوں کے دلوں میں سحر انگیز اثر پیدا کیا۔ رفتہ رفتہ افرادی قوت کا ایک بڑا ریلہ آپکی ہر بات کو حرف آخر اور سند مان کر میدان میں کود پڑا ہر گھر سے چندوں کی بھرمار شروع ہوئی خصوصاً خواتین نے اپنے زیوروں کو لا کر آپکے پاؤں میں ڈھیر کر دیا۔ تحریک دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا FM چینل کے ذریعے معاشرے میں رونما ہونے والے کئی سرگرمیوں کو حرام قرار دیکر انکی ممانعت

کے احکامات جاری کیے گئے لاکھوں سی ڈیز اور ٹی وی وغیرہ کو جلا دیا گیا۔ خواتین برقعوں میں ملبوس ہوتی گئیں۔ سینما گھر سنسان رہ گئے نائی خانے بند ہونے لگے۔ کیسٹوں کی دکانیں ناپید ہونے لگی۔ اور یوں تھوڑے عرصے میں سوات کی فضاء بالکل بدل گئی۔

اسی اثناء میں حکومت وقت نے حکومتی رٹ قائم کرنے کے لئے فوجی اپریشن کا حکم دیا۔ جولائی 2007 میں سوات میں پہلا دھماکہ ہوا اور اسی طرح آئے روز کشیدگی نے جنم لینا شروع کیا۔ آخر جنت نظیر وادی سوات کی سینے پر اگ اور بارود کا کھیل گرم ہوتا گیا ہزاروں سہاگیں اُجڑ گئیں۔ گلستان چمن میں بارود کی تخم ریزی کی گئی۔ بم دھماکوں، قتل و غارت اور پھانسیوں کی قطاریں لگ گئیں۔ نظام کے جلادوں نے نظام کا گلہ گھونٹنے لگا۔ فلک لوہا برسانے لگا۔ اور زمین شعلے اگلنے لگی۔ حکومت نام کی کوئی چیز نہ رہی۔ ہر منظر ماتم کدہ اور ہر گوشہ آتش کدہ دکھائی دینے لگا۔ تین سال یہ ہنگامہ اور خونی منظر حالات کے زیر و بم کے ساتھ چلتا رہا۔ اسی حالات میں بونیر کی مٹی کس طرح محفوظ رہ سکتا تھا۔ آخر 2009 میں بونیر کے در و دیوار ہلنے لگے اسی آگ کے شعلے بھڑک کر آن ہی آن میں پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لی۔ اور اسی طرح پوری ڈویژن میں ایک کہرام سی مچ گئی۔ لوگوں کو جان کے لالے پڑنے لگے۔ چغرزئی میں ایک رات میں سارے تعلیمی اداروں کو کلی یا جزوی طور پر مسمار کر دیا گیا۔ توپوں کے گھن گرج، بارود کے گھٹا ٹوپ اندھیروں اور نشانہ باندھے سنگینوں کے درمیان رہ کر زندگی کا خواب احمقوں کی جنت نظر آنے لگی۔

ایسی صورت حال میں حکومتی فرمان پر 30,35 لاکھ عوام کو تاریخ کی بدترین ہجرت کا تلخ گھونٹ پینا پڑا ضلع بونیر کے معصوم بچوں، بوڑھوں اور سادہ لوح عوام نے بھی گھر بار چھوڑ کر پختونخواہ کے چپے چپے میں انتہائی کسمپرسی کی حالت میں رہنے پر مجبور ہو گئے تین چار مہینے اپنے پختون بھائیوں نے انہیں اپنے پاس ٹھہرایا۔ اور اسکی خدمت برادری اور کفالت میں ایسا مثال قائم کیا جس نے پشتون روایات اور پشتون تاریخ کو زندہ کر کے رہتی دنیا تک ایک عبرت اور مثال چھوڑ دی۔ لیکن اپنا گھر تو اپنا گھر ہوتا ہے۔ کے مصداق اس ہجرت نے ڈویژن کے عوام کے دلوں اور زہنوں پر پریشانی اور صدمے کے اتنے چاپ چھوڑ دیئے جنکے سائے تلے اس دھرتی کے متوالے اب بھی ذہنی تاسف اور

بے چینی کے شکار ہوتے چلے آرہے ہیں۔

تین چار مہینے ہجرت کی اس کڑوے گھونٹ کو حلق سے اُتارنے کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں اور علاقوں کو واپس ہوئے۔ لیکن حالات پھر بھی مکمل طور پر قابو میں نہیں رہے۔ اسی اثناء میں حکومت نے حالات کو قابو میں رکھنے اور انتظامی مشکلات کے پیش نظر ضلع سوات اور بونیر میں ریگوہر پولیس اور سپیشل فورس پولیس کے جوانوں کو بڑے پیمانے پر بھرتی کیے اور ساتھ ساتھ پولیس سٹیشنوں اور سب تحصیلوں کو تحصیلوں کا درجہ دینے کے منظوری بھی دے دی۔

اس تناظر میں بونیر کے مزید تین سب تحصیلوں کو فل تحصیلوں کا درجہ دیا۔ چار پولیس سٹیشنوں کے بجائے آٹھ پولیس سٹیشنوں کی منظوری عمل میں لائی گئی۔

اور علاقہ چغرزئی ڈگر پولیس سٹیشن کے بجائے گل بانڈی پولیس سٹیشن کا زیر کنٹرول علاقہ قرار پایا گیا۔

صوبائی حلقہ بندی کی تحت اسکا تعلق PF78 سے کیا گیا ہے۔ جبکہ بلدیاتی انتخابی حلقہ کے تحت یہ چار یونین کونسلوں بٹاڑہ، پاندھیڑ، گلبانڈئی اور سورے میں تقسیم کیا گیا ہے۔

چغرزی سیاسی تاریخ کے آئینے میں

یونانی لکھاریوں کے بیان کے مطابق سکندر اعظم کے حملے کے وقت شمال مغربی ہند میں کو ئی سیاسی وحدت نہیں تھی۔ تمام علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ان میں بعض ملوکیتیں اور بعض قبائلی حکومتیں تھیں۔ ان میں بڑی بڑی سلطنتیں پورس، ابھیسارا، ٹیکسلا، کھتوئی اور گندھارا تھیں۔ ان میں گندھارا بہت بڑی سلطنت تھی۔ جس کا ذکر ہمیں ویدو برہمن، گرنتھوں اور پرانوں میں ملتا ہے گندھارا کے باشندوں کو گندھاری کہا گیا ہے انکے علاوہ ہمیں گندھارا کے حدود اسکے بادشاہوں اور مشہور جڑواں شہروں کے بارے میں بھی معلومات ملتے ہیں۔ جن کے مطابق سور جیت اور لگنجیت گندھارا کے مشہور بادشاہ تھے ٹیکسلا اور پشکراوتی یعنی چارسدہ اسکے مشہور شہر تھے اور اسکے حدود میں کم از کم موجودہ اضلاع راولپنڈی اٹک، پشاور اور مردان پر مشتمل تھی۔ پرانوں کے مطابق گندھارا دوروہوں قبیلے کا بادشاہ تھا جب مان دھاتا نے اسے شکست سے دوچار کر کے قتل کر دیا تو اسے ہیرو تسلیم کر لیا گیا یہاں تک کہ سلطنت کا نام بھی اسکے نام پر گندھارا رکھ دیا گیا۔ سکندر کے حملے کے وقت گندھارا پانچ بڑے ریاستوں اور مقامی چھوٹے چھوٹے راجواڑوں اور نوابیوں پر مشتمل تھا۔

ریاست کونڑ، ریاست نیسا، ریاست گوری، ریاست اُدھیانہ اور ریاست پشکلاوتی گندھارا کے دریائے سندھ کے اس پار کے ریاست تھی جبکہ دریائے سندھ کے اس پار خودمختیار ریاستیں ٹیکسلا، ابھیسارا اور اُوراسہ بھی گندھارا میں شامل تھیں۔ اوراسہ کی ریاست کی سرحدیں ہنڈ کے مشرقی کنارے وادی ہزارہ کے سارے علاقے اور کشمیر کے پہاڑوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ناول ''سکندر اعظم'' کے مصنف رحیم شاہ رحیم کے مطابق سکندر کے لشکروں کی یلغار یونانیوں کی غیرت اور بہادری کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ایک مرکزی حکومت کی فقدان اور یہاں کے بے شمار چھوٹے راجاوں اور باد

شاہوں کی آپس میں نااتفاقی تھی۔

(ا ڈاکٹر۔اے۔سٹائن کا نظریہ ہے کہ یہ نام اُرسہ سے ماخوذ ہے۔ جو کہ پکھل کا پُرانا نام ہے۔ اُرسہ کا نام اورش تالاب کی وجہ سے ہے مقامی آبادی اس تالاب کو اورش کے نام سے جانتی تھی۔

سکندر اعظم کے حملے سے بہت پہلے 558-529 ق م میں کورش اعظم نے دنیا کی بڑی سلطنت قائم کی تھی اُس نے برصغیر اور سارے مغربی ایشیاء سے لیکر مشرق میں دریائے سندھ تک سارے علاقے کو فتح کیا تھا۔ اُسکے بعد اُسکے بیٹے نے مصر پر حملہ کر کے فتح کیا۔ اور آخری فرعون کو ایران کے سوس نامی شہر میں قید کر دیا۔ اسکے بعد آپ کے جانشین دارایوش نے بحر روم سے بحر ہند کے ساحل اور بحر اسود سے بحر عرب تک سارے مغربی اور مشرقی دنیا کو زیر نگین بنایا۔ اُس نے اپنی سلطنت 20 بیس صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔ جن میں تین صوبے دریائے سندھ میں تھے۔ یہ تین صوبے گندھارا، ھندوش (سندھ، پنجاب) اور گدورشیہ (مکران، بلوچستان) تھے۔

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت چغرزی کا سارا علاقہ گندھارا کا ایک حصہ تھا۔ جو اُدھیانہ اور ریاست اوراسہ دونوں میں اپنے پنجے گاڑھ چکا تھا اُنکے علاوہ یہاں چھوٹے چھوٹے نوابیاں اور راجواڑوں کا وجود بھی کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر معلوم ہوتا ہے۔ جو اپنے اپنے قلعوں اور علاقوں تک محدود تھیں اور آپس میں کسی بھی خوشگوار تعلقات اور رروابطہ کے روادار نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنکے بے اتفاقی سے فائدہ اُٹھا کر سکندر نے آسانی کے ساتھ اُنکو ایک ایک کر کے روند ڈالا۔ یہ سلسلہ سینکڑوں سالوں پر محیط رہا۔ یہاں سکندر آیا، بدھ مت کا دور گزرا، ہندوشاہی بھی چھا گئی۔ آخر میں قبیلہ یوسف زی یہاں کے سیاہ وسفید کے مالک بن بیٹھے اور اپنے قبائلی نظام کے زیر سایہ زندگی کے گاڑی کو چلتا رکھا۔ اپنے قبائلی اور آزاد ومختیار دائرے میں رہتے ہوئے پشتو روایات اور رسم ورواج نے معاشرے کو 2 دو واضح دھڑوں میں تقسیم کیا۔ اور دونوں کی مہاریں علاقے کے خوانیں اور مؤثر خاندانوں کے ہاتھوں تھما دی گئی۔ قبائلی نظام زندگی ہر وقت قبائل کی خانہ جنگی، دیہاتی اور علاقائی برتری وکمزوری اور سرداری جاگیرداری کے مرہون منت ہوا کرتی تھی۔ جسکی لاٹھی اُسکی بھینس والا معاملہ تھا۔ طاقت اور لشکر کے بل بوتے پر زندگی کا پہیہ روکا

اور چلایا جاسکتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے نوابیاں اور سرداریاں اپنے لاؤلشکر کے ذریعے پڑوس پر جب موقع پاتا حملہ اور ہو جاتے تھے۔ کوئی ضابطہ، قانون اور مرکزی وحدت نہیں تھی۔ ہر بات کو آنانیت اور خودسری کا جامہ پہنایا جاتا اور پھر سالوں تک دشمنیاں چلتی خان اور خوانین علاقے کے بے تاج بادشاہ تھے۔ اور عام لوگ اُنکے ڈنڈا بردار اور اسلحہ بردار لشکری، بیگاری اور ملاتڑ ہوا کرتے تھے۔ اُنکے قلعہ جات اور بُرج ایک طرح کے حوالات اور عدالتیں تھیں۔ ہر چیز پر جمود طاری تھی۔ زراعت، معیشت، اور سماجی انصاف کا بُرا حال تھا۔ یہ دور تاریخ میں پشتو دور یا پشتو زمانہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایسے میں اس قبائلی خودمختار بیلٹ کو سیاسی اور انتظامی دھارے میں لانے کے لئے کچھ قوتیں حرکت میں آگئیں۔ اور ریاست سوات کی وجود کے لیے آہستہ آہستہ میدان سازگار ہونے لگا۔ ریاست کے طول وعرض میں پشتو دور کے اُن دھڑوں میں سے ہر علاقے میں ایک دھڑے کی حمایت کے لیے ریڑی چوٹی کا زور لگایا گیا، اُنہیں ہر قسم مراعات کی پیشکشیں ہونے لگیں اور اُن ہی کے لشکر اور قوت کے ذریعے رفتہ رفتہ ایک وسیع سلطنت کی وجود ممکن ہوئی۔ ریاست سوات وجود میں ائی تو معاشرہ پھر 2 دو دھڑوں میں تقسیم نظر آنے لگا۔ ایک ریاست حمایتی ڈلہ کہلایا جانے لگا جبکہ دوسرا مخالفت میں چلا گیا۔ اور خفیہ طور پر ریاست مخالف سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ مذکورہ دونوں ڈلے نہ صرف علاقہ چغرزی بونیر تک محدود ہوتے گئے بلکہ ریاست کے طول وعرض میں چار سو دکھائی دینے لگے۔

بر سبیل تذکرہ ریاست حمایتی ڈلہ میں چغرزی میں بٹاڑہ کے غفار خان اور بہرام خان، تیڑہ کے عبداللہ خان، شمنال کے خان بابا، ٹوپی کے سکندر خان بابا، گنبت کے ناصر بابا، مرادو کے سلطان خان احمد علی خان اور بیخانئی کے فضل رحمٰن خان کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس طرح بادشاہ مخالف ڈلہ میں گلونو باوڑی کا اللہ یار کاکا، گنبت کا تور خان اور ٹانگوڑہ کے پسند خان شامل تھے۔ سیاست میں چونکہ حرف آخر نہیں ہوتا اسلئے ریاستی دور میں وہ خوانین جو 2 دو واضح دھڑوں میں تقسیم تھے۔ ریاست کے پاکستان میں انضمام کے بعد سیاسی طور پر منتشر ہو کر مختلف سیاسی پارٹیوں میں شامل ہوتے گئے۔ اور سیاست میں آج کے دشمن کل کے دوست کے مصداق ماضی میں جو ایک دوسرے

کے جان کے دشمن کے تھے آج ایک پلیٹ فارم پر جمع ایک ہی منشور کا ورد کرنے لگے۔ اُسکے برعکس ایک مورچہ اور ایک سنگر میں بیٹھے آج مختلف سیاسی مورچوں سے ایک دوسرے کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔

جب 1969ء میں ریاست سوات پاکستان کا باقاعدہ انتظامی یونٹ قرار دیا گیا۔ تو ریاست کے لوگ واضح طور پر مختلف سیاسی پلیٹ فارمز پر نمودار ہونے لگے لیکن ان میں 2 دو پارٹیاں قومی اور مذہبی ریجنڈ الیکر ANP اور جماعت اسلامی کی صورت میں چغرزی بونیر کے سیاسی اُفق پر چھا گئے تاہم وہ علاقائی سیاست میں بنیادی رول ضرور ادا کرنے لگے۔ یہاں کے لوگوں کی صاف گوئی، قومی حمیت، حریت پسندی اور مذہبی لگاؤ کی بدولت اُنھوں نے جس سیاسی ٹولے کو دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اُنھوں نے ہر میدان میں اسے بھاری اکثریت سے جتوایا۔ ضیاء الحق کے اعلان کردہ غیر جماعتی انتخابات میں بونیر میں گدیزی کے محمد خان، تورورسک کے بختی جہان خان، کلپانی کے حبیب الرحمان خان، طوطائی کے محمد کریم بابک اور چغرزی میں گنبت کے قمرین خان ضلعی سطح پر اپنے اپنے علاقوں کے ضلعی ممبرشپ کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔

ریاست کے انضمام کے بعد بیخانئی کی مضبوط خان ازم بھی 2 دو ٹکڑوں میں بٹ کر بیخانئی کے اسماعیل خیل نے عوامی نیشنل پارٹی مین اعلان کیا اور میرہ گئی کے اسماعیل خیل نے جماعت اسلامی کے وفاداری کا حلف اُٹھایا۔ واضح رہے کہ ریاستی دور میں خان میرہ گئی احمد خان بہت زورآور خان، ریاست کا منظور نظر اور حاجی صاحب ترنگزئی کے جہادی قافلہ کا نہ صرف عینی شاہد بلکہ اسکا متحرک اور بہادر غازی بھی رہا ہے۔

جماعت اسلامی کی استحکام میں میرہ گئی کی خوانین کا مثالی اور تاریخی کردار رہا ہے۔ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر یہ اعزاز اس دور افتادہ وادی میں واقع حسین بستی کو حاصل ہے جسمیں صدفی ووٹ لیکر مخالفت میں دانستہ طور پر کوئی ووٹ نہیں جانے دیا جاتا۔ اسلئے کہ چغرزی کے بعض علاقوں میں پارٹیوں کی سطح پر علاقائی روایات، ڈلہ سسٹم اور جاگیردارانہ قوت و طاقت کا زیادہ پاس رکھا جاتا ہے۔ جبکہ بعض علاقے ایسے بھی ہیں۔ جو آزاد اور جمہوری طرز کے فیصلوں میں خودمختار

ہوتے ہیں۔علاقہ چغرزی میں جماعت اسلامی کی مضبوط پوزیشن اور سیاسی قوت کی اصل وجہ ان لوگو ں کی اسلام سے والہانہ محبت اور عقیدت پر مبنی ہے۔ ماضی میں جتنے بھی اصلاحی اور نظریاتی تحریکیں اُٹھی ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے اُنکا بھرپور ساتھ دیا ہے۔

حاجی صاحب ترنگزی کے ساتھ شانہ بشانہ لڑ کر آپکے جہادی قافلے میں مردانگی کے جوہر دکھائے ہیں۔سید احمد شہید کے مجاہدین کو کھلے دِل اور خندہ فشانی سے قبول کر کے اُنکے ہر ممکن مدد کی ہے۔ٹانگوڑہ میں اُنکے تاریخی یادگاریں اور مزارات آج بھی تحریک مجاہدین کے عظمت رفتہ اور یہاں کے باشندوں کی ایمانداری اور غیرت کی داستانوں کو تازہ کر دیتی ہیں۔اپنے انفرادی زندگی میں بھی صوم وصلوٰۃ کے پابند انتہائی منکسر المزاج اور وسیع النظر اوصاف کے مالک ہیں یہی وجہ ہے۔کہ مذہبی آواز لگا کر اُٹھنے والی جماعت اسلامی کے اس تحریک کو بھی اُنھوں نے امنا وسلمنا کہکر قبول کیا ہے۔دوسری جانب یہاں عوامی نیشنل پارٹی کی اکثریت کی بنیادی وجہ یہ ہے۔کہ یہاں کے زیادہ تر لو گ محنت مزدوری کے سلسلے میں کراچی میں مقیم ہیں۔بعض وہاں اپنے چھوٹے موٹے کاروبار سے بھی وابسطہ ہیں۔کراچی میں چونکہ پشتونوں کی شناخت اُن کی قومیت اور زبان ٹھرتی ہے اور اُنکی قومی وحدت اور آواز کو قوم پرست قائدین کے ساتھ نتھی کیا جاتا ہے۔جسکی وجہ سے یہ لوگ ایک سیاسی اور قومی وحدت میں داخل ہو کر اُن پر ANP کا لیبل لگ جاتا ہے۔اور جب اپنے اپنے علاقوں میں آتے ہیں تو ANP کے پلیٹ فارم سے سیاست کرتے اور اسکے فعال اور سرگرم ارکان بنتے ہیں۔

1995ء کے وسط تک یونین کونسل بٹاڑہ ANP کا گڑھ ہوا کرتا تھا۔کیونکہ ایک تو اسے یہاں کے شمنال کے خوانین کا بھرپور حمایت حاصل تھی۔اور دوسری جانب ریال کے نابغہ روزگار اور سیاسی میدان کے سُلجھے ہوئے۔تجربہ کار اور سرگرم کارکن فانوس گوجر کا سیاسی کیریئر بھی ANP پلیٹ فارم کو ہر وقت مصروف اور زندہ رکھتا تھا۔لیکن بعض وجوہات کی بناء پر متذکرہ دونوں مضبوط قوتوں نے اپنے راہیں جُدا کر کے ANP کو خیر باد کہا۔اور نئے سیاسی عزم کے ساتھ اُٹھ کر ملک کے کونے کونے سے بڑی تعداد میں مزدوروں اور محنت کشوں کو جمع کر کے راولپنڈی پریس کلب میں 3 جون 1995 کو پاکستان عوامی پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت کا اعلان کیا۔ملک کے

چاروں صوبوں مین دفاتر کھولیں اور ایک مرکزی دفتر ڈھوک کالا خان پنڈی میں کھولا۔ملک کے طول وعرض میں پارٹی سرگرمیوں کا اغاز کرنے لگے اور فانوس گوجر اس نئے جماعت کا بانی اور قائد کی حیثیت سے نمودار ہونے لگا۔

علاقہ چغرزی بہت سے خوبیوں کا مالک ہے اسکی جنت نظیر محل وقوع اور حسین نظاروں والی سرزمین نے ایسے سپوتوں کو جنا ہے۔جنہیں سیاسی بصیرت ورثے میں ملی ہے۔وہ سیاست کرنے اور چلانے کے گُر خوب جانتے ہیں اسلیئے تو صوبائی اور علاقائی سیاست کے علاوہ ملکی سطح پر PAP کا منبع اور سرچشمہ یہ حسین وادی ہے۔جو الائنس بنانے، ٹکٹیں دینے اور پارٹی لائے عمل طے کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔اور سیاسی امیدوار انہی پہاڑوں اور چٹانی وادیوں میں بسنے والے سپوتوں کا منہ تکتے اور اُنکی قول کو آئین اور سند مان کر یہاں کا یاترہ کرتے ہیں PAP۔کیقائد فانوس گوجر کی حیثیت نہ صرف پارٹی قائد کی ہے۔بلکہ پنجاب اور سندھ کی چودھریوں اور وڈیروں کی نظر میں اسکا مرتبہ مشفق اُستاد اور بڑے پیر ومرشد سے کسی قدر کم نہیں اسلیئے کہ وہ اُنکے قوم اور قبیلہ سے ہیں اور گوجر قوم کے آئیر شاخ سے اُسکا تعلق ہے۔PAP اب APP کے نام سے پہچانی جاتی ہے کیونکہ پاکستان کے تین ترقی پسند چھوٹی سیاسی گروہوں نے APP میں ضم ہو کر نیا منشور اور نئے عزم کے ساتھ میدان سیاست میں قدم رکھا ہے۔اسکا باقاعدہ اعلان بونیر کے مرکزی شہر سواڑی میں 8 فروری 2012 کو ڈگر گراونڈ میں منعقدہ جلسہ میں ہو چکا ہے۔ایک طرح سے یہ ایک تاریخی جلسہ تھا۔کیونکہ ایک تو اسمیں چار سیاسی گروہوں کے باقاعدہ انضمام کا اعلان کیا گیا اور دوسری جانب بہت سارے چھوٹے شمولیتی اعلانات کے ساتھ ساتھ کثیر تعداد میں لوگوں کی شرکت رہی۔عام لوگوں کے علاوہ پنجاب اور سندھ کے سیاسی اکابرین ڈاکٹر حسن ناصر، پروفیسر جمیل عمر، شازیہ خان، ایوب مری اور رمضان میمن نے اس تاریخی جلسے سے خطاب کر کے علاقے کے لیے باعث فخر اور افتخار ٹھہرا ۔پروفیسر جمیل عمر کو APP کا سکیرٹری جنرل مقرر کیا گیا اور صدارت کا اعزاز اس علاقے کے سپوت فانوس گوجر کے سر سجایا گیا۔

بلدیاتی انتخابی حلقے کے لحاظ سے چغرزی بونیر چار یونین کونسل پر مشتمل ہے

۔2002 کے بلدیاتی انتخابات میں سورے یونین کونسل کے ناظم اور نائب ناظم بالترتیب حجاب اللہ اور مکرم خان جماعت اسلامی سے کامیاب ہوئے۔ یونین کونسل گلبانڈی جو کہ ANP کا گڑھ ما نا جاتا ہے۔ یہاں گنبت کے تورخان کے خاندان کا کافی عرصہ سے بہت سی قربانیاں رہی ہیں۔ او رمئوثر خاندان ہونے کی سبب اپنا مضبوط سیاسی اور سماجی حلقہ رکھتا ہے۔ اسی خاندان کے عبدالخالق خان اور بختی زیب ANP کے پلیٹ فارم سے مسلسل 2 دو دفعہ (2002ء-2005ء) ناظم اور نائب نظامت کی نشستیں جیت چکے ہیں۔

اس خاندان کے اقبال خان ضلعی سطع پر چیرمین زکواۃ بھی رہ چکا ہے۔ پاندھیڑ یونین کونسل سے PAP کے بختی افسر خان ناظم اور JI کے امیدوار شمس لظاہر 2002ء کے الیکشن میں نا ئب ناظم منتخب ہو چکے ہیں جبکہ ٹاؤن ناظم کی سیٹ بھی شمس الظاہر نے حاصل کی ہے۔ اسی طرح بٹاڑہ یونین کونسل جو کہ آجکل PAP کا مرکز ہے۔ اور اسے شمنال کے شرن خان بابا کے خاندان کا مکمل سپورٹ اور آشیر باد حاصل ہے 2002ء اور 2005ء میں مسلسل PAP کے عبدالوارث اور خان زادہ نے بالترتیب ناظم اور نائب نظامت جیتے ہیں۔ جبکہ 2005 میں۔ اسی پارٹی اور خان بابا کے خاندان کے چشم و چراغ شیر زمان خان نے ٹاؤن نظامت کی پوزیشن جیت کر چغرزی کے لیے بڑا سیاسی اعزاز جیتا۔

2005 میں سورے یونین کونسل نے سابقہ حیثیت برقرار رکھتے ہوئے JI کے امیدوار میرہ گئی کے مجاہد نے نظامت جیت لی۔ اور انکے ساتھ ANP پلیٹ فارم سے نائب نظامت بازارکوٹ کے بخت روز خان نے جیت لی پاندھیڑ یونین کونسل میں ANP کے نور شاہد نائب ناظم اور JI کے احمد حیات ناظم منتخب ہوئے ہیں قومی اور صوبائی سطع پر ضلع بونیر تین صوبائی اور ایک قومی سیٹ پر مشتمل ہے۔ علاقہ چغرزی بونیر PK-78 کے انتخابی حلقے میں شامل ہے۔ اسکے ساتھ بونیر کے دولت زئی صوبائی حلقہ انتخاب میں شریک ہے۔ جبکہ 2001 سے پہلے ضلع بونیر 2 دو صوبائی اور ایک قومی حلقوں پر مشتمل تھا۔ قومی حلقے میں بونیر کے ساتھ آج کے ضلع شانگلہ کا کچھ علاقہ بھی شامل ہوا کرتا تھا۔ ضلع بونیر میں اگرچہ دوسری سیاسی دھڑوں کی بھی کسی حد تک عملی سیاست میں عمل دخل ہے۔ لیکن

انتخابی محاذ جماعت اسلامی اور ANP کے درمیان گرم رہتا ہے جبکہ PPP اور مسلم لیگ بھی مئوثر سیاسی قوتوں میں شمار ہوتے ہیں 1970 سے آج تک سب ڈویژن بونیر اور پھر ضلع بونیر میں جتنے انتخابات ہوئے ہیں اُن میں صوبائی سطح پر مسلم لیگ قیوم گروپ، ضیاء الحق گروپ اور جونیجو گروپ سے عبدالروف خان ڈگر، امیر نواب خان کلپانی اور سرزمین خان چناڑ بالترتیب 1970 1985 اور 1990 میں صوبائی ممبران منتخب ہو چکے ہیں جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی کے نادر خان 1993 میں صوبائی سیٹ جیت چکے ہیں پھر آپ کے اچانک وفات پر 1994 میں آپکا بیٹا شیر اکبر خان اس سیٹ پر براجمان رہے۔ اسی طرح 2002 کے انتخابات میں PPP کے شیر اکبر خان نے قومی اسمبلی کی سیٹ جیت کر ضلع بونیر کے لیے ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے اور اُنکے ساتھ PF-77 سے جمشید خان PPP کے ممبر صوبائی اسمبلی کامیاب ہوئے۔ اسی طرح صوبائی سطح پر جماعت اسلامی کے بخت جہان خان چار مرتبہ صوبائی اور دو مرتبہ ضلعی ممبر رہ چکے ہیں، ساتھ صوبائی اسمبلی کی سپیکر شپ کا اعزاز بھی موصوف کو حاصل ہے، ایک بار حبیب الرحمن خان JI کے پلیٹ فارم سے ممبر صوبائی اسمبلی بنے اور قومی سطح پر فضل رازق خان نے جماعت اسلامی کے طرف سے 2 دو مرتبہ ممبر منتخب ہو کر ضلعی نمائیندگی کی۔

جماعت اسلامی کے شانہ بشانہ ہمیشہ جو جماعت سیاسی میدان میں مدمقابل رہی وہ عوامی نیشنل پارٹی ہے۔ اس پارٹی کے پلیٹ فارم سے عبدالمتین خان (مرحوم) چار مرتبہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ 2008 میں آخری کامیابی کے بعد وفات گئے تو اپکے خالی کی ہوئی نشت پر ضمنی الیکشن میں آپکا بیٹا استقبال خان منتخب ہوئے اور آج ضلع بونیر کا منتخب قومی ممبر ہے۔

صوبائی سطح پر عوامی نیشنل پارٹی کے عبدالکریم بابک 2 دو مرتبہ اور سید رحیم خان تین مرتبہ صوبائی ممبران منتخب ہوئے۔ اسی طرح 2008 کے انتخابات میں عوامی نیشنل پارٹی نے قومی اور صوبائی سطح پر کلین سویپ کر کے تین صوبائی اور ایک قومی نشیستں حاصل کیں اور بلاشرکت غیرے ضلع بونیر کے سیاسی منتخب حکمرانی کا تاج اپنے سر پر رکھا۔ آج کل اس ضلع کے pk-77-78-79 سے با ترتیب سردار حسین بابک، وزیر تعلیم خیبر پختونخواہ، قیصر ولی اور سید رحیم خان منتخب ممبران صوبائی اسمبلی

ہیں۔انکے علاوہ ضلعی نظامت اور ضلعی زکواۃ چیرمین شپ کی مہاریں بھی اس پارٹی کے منتخب نمائندہ گان کے ہاتھوں میں ہیں۔ مستقبل میں علاقہ چغرزی کے سیاسی تقدیر کے بارے میں خصوصاً اور ضلع بونیر کے بارے میں عموماً۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ نئے سیاسی بندھنوں اور سرگرمیوں نے سیاسی فضا کو کافی ششدر اور غیر یقینی بنا دیا ہے۔

خاوندان فن وقلم

کہتے ہیں کہ کائنات مترنم ساز سے عبارت ہے جو اپنے اندر عجیب کشش اور رومان رکھتا ہے اور یہ آہنگ اور سرُ ور آگے جا کر عشق ناتمام اور نالہ جاویداں میں بدل کر ایک تڑپ اور آرزو کو جنم دیتا ہے۔ یہی آرزو اور بے چینی اسی عشق کے گود میں سر رکھنے کے لئے مختلف خانقاہوں کے ثناخوان بن جاتے ہیں۔ آگے جا کر سارے ماحول کو موسیقی کے زیر و بم میں لپیٹ کر اسے ایک ہی وحدت میں پرو دیتی ہے۔

لیکن جب اسے الفاظ اور ترتیب کا جامہ پہنایا جائے اور مخصوص لے کے ساتھ اس کا ورد کیا جائے تو وہ پھر ہر ذی روح اقرار کر دیتی ہے مزید جا کر یہ امتیازی شکل اپنا کر خاص علاقہ اور جغرافیہ کا ورثہ بن جاتا ہے اور یہ تب تک اپنا وجود اور حسن برقرار رکھتا ہے جب تک اسے پُر امن قدرتی ماحول میسر ہو۔ تاریخ میں بھی ایسے ماحول کو انسانی تہذیت کا اولین گہوارہ قرار دیا گیا ہے۔ یہاں قدرتی موسیقی اور ترنم کی جو مالا وجود میں آئی ہے۔ وہ ہر دل اور ہر ضمیر پر بلا امتیاز نسل اور علاقہ یکساں اثر چھوڑتا ہے اور اس جغرافیہ اور علاقہ سے اٹھنی والی قوم اور انکی زبان وثقافت انسانی تہذیب وثقافت کی اصل امین اور وارث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شمال اور شمال مغرب میں رہنے والی پشتون بیلٹ اور انکی زبان اور ثقافت ان میں سے ایک ہے اور انڈو آرین زبانوں کی جتنی کڑیاں ہیں وہ تمام کی تمام اس پشتو کی بیٹیاں اور پوتیاں قرار دی جا چکی ہیں۔ اسلئے اس سے پیوستہ زبانوں میں وہ حلاوت اور مٹھاس دنیا کی ہر قوم میں بڑی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ کائنات اپنے اندر ایک مترنم صاف وشفاف ساز رکھتا ہے۔ اسلئے انسانی تہذیب کی اولین جغرافیائی گردوپیش اور قوم میں اس لے اور سر کا پایا جانا

قدرتی امر ہے۔اگر دیکھا جائے تو پشتون واحد قوم ہے جسکا ہر بچہ، بوڑھا اور مرد وزن کسی نہ کسی شکل میں شاعرانہ ذوق سے مخمور ہوتا ہے۔اسے اپنی زبان کی ایک نہ ایک صنف میں ضرور یا تو طبع آزمائی کا عنصر موجود ہو اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو پشتو کے انمول صنف ٹپہ میں اسے کئی ٹپے ازبر ہو یا تنہائی میں قدرتی موسیقی سے مسرور ہو کر راہ چلتے گنگناتا ہوا ہوگا اور اس روحانی ترنم اور فطری موسیقی کے لئے پشتونوں کے درے، جنگلات، جھیلیں، پگڈنڈیاں، گنگناتی ندیاں اور لڑھکتی آبشاریں ہوتی ہیں۔جو قدرتی سرور اور موسیقی کے سرچشمے اور بیدایشی آستانے قرار پائے جاتے ہیں۔جہاں بھی دور جدید کے مضر اثرات سے دور پشتونوں کے پنچائتی نظام زبان، ثقافت اور تربیتی مراکز حجرے آباد ہوتے ہیں وہاں پیار و محبت، رواداری، چادر و چار دیواری اور بھائی چارے کی تقدس بحال اور انسانی اقدار مربوط اور مستحکم ہونگے۔علاوہ ازیں ادبی حلقہ جو کہ کسی علاقہ اور قوم کے اصل وارث اور علمی ورثہ ہوتا ہے اور جہاں عوامی ادب جو کہ دستار افتخار اور شان تصور کی جاتی ہے روز بروز پروان چھڑتا اور پھلتا پھولتا ہے۔

علاقہ چغرزی عوامی لوک گیت کے حوالے سے بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔اسکے حجرے اور بیٹھک ہر وقت علاقائی گیت اور آلات موسیقی سے گرم اور پر جوش ہوتے ہیں۔یہاں زمانہ قدیم سے رباب، ستار اور بانسری وغیرہ کی محفلیں سجتی ہیں اور مقامی ادب کو مترنم آواز اور لے کیساتھ فن موسیقی کے حوالہ کئے جاتے ہیں۔یہاں خوشی کے تقریبات کئی کئی دن چلتے رہتے ہیں خواتین چار دیواری کے اندر خوشی کے تقریب کو چار چاند لگا کر اپنے مخصوص انداز اور علاقائی مزاج کے مطابق رقص و سرور کی محفلیں کرتی ہیں اور لوک گیتوں کے ساتھ ناچتے ہیں۔لیکن یہ سب کچھ ایک قانون، قاعدہ اور ضابطہ کے اندر ہوتے رہتے ہیں۔حیا اور چادر و چار دیواری کا ہر حال میں خیال رکھا جاتا ہے۔ موسیقی اور گلوکاری سے وابستہ یہ فن کار پیشہ ور نہیں ہوتے بلکہ اپنے شوق اور ذوق کی پیاس بجھانے کی خاطر وہ اس فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

موسیقی اور لوک گیت کے اس میدان میں راقم کی تحقیق کے مطابق جن اصحاب کے نام آتے ہیں ان میں سے ایک عبدالقیوم عرف قیم ہے جو کہ بٹاڑہ (تالہ) کا باشندہ تھا۔آج سے قریباً

تیس سال پہلے فوت ہو چکے ہیں۔رباب کے ماہر استاد تھے، پیشہ کے اعتبار سے ملا تھے، چغرزی کے گاؤں فیزے کے رہنے والے فیزے بابا کے ہم عصر تھے۔عبدالقیوم بابا کا بھتیجا جو بقید حیات ہے اور اپنی عمر کی تقریباً نویں بہاریں دیکھ چکے ہیں، اپنے وقت کے مٹکے کے ماہر تھے۔آج سے قریباً ساٹھ سال پہلے بٹاڑہ کے رہنے والے مایہ ناز موسیقار مولخ بابا اپنے وقت کے منجھے ہوئے ستار چی ہو گزرے ہیں جو ستار بجانے میں ایسے ماہر تھے کہ ساری محفل کو محو رقص بنا دیتے تھے۔ملخ بابا اپنے زمانہ میں یہاں کے لوگ تلاش روزگار کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف شہروں احمد آباد (امنہ آباد)، مدراس، دہلی اور بمبئی وغیرہ میں مقیم رہتے تھے۔ملخ بابا نے بھی بمبئی میں تلاش روزگار کے سلسلہ میں کافی عرصہ گزارا اور واپس لوٹ کر یہاں وفات پا گئے۔

اسی بٹاڑہ کا ایک فرزند جو کہ عشیزے بابا کے نام سے پہچانا جاتا تھا، تقریباً ایک سو گیارہ سال کے بزرگ ہیں لیکن دل میں اب بھی جوانوں جیسے جذبات رکھتے ہیں۔چھوٹا قد مگر آواز اور قدم میں پھرتی رکھتا ہے۔جو یقیناً قابل دید ہے۔اس طرح آپکی عقابی نظر آج بھی چوٹیوں کی سیر کر کے نہیں تھکتا۔جہاں بھی بانسری کی بحث چلتی ہے اور بانسری کی زیر و بم اور ماہرانہ فن کا ذکر ہوتا ہے عشیزی استاد کی مثال دی جاتی ہے۔اسکے علاوہ وہ تاریخ کے کئی واقعات کا جہاندیدہ بھی رہا ہے۔بادشاہ صاحب کی عملداری اور حاجی تورنگزئی صاحب کی جہادی داستان انکے سینے میں زندہ تاریخ کی کتاب کی شکل میں محفوظ ہے۔

عشیزے ولد عیدا ولد جلات کا زیادہ عرصہ شمنال کے خان بابا (شرن خان) کے زیر سایہ انکے گھرانے کی خدمت براری میں گزرا ہے۔وہ خان بابا کا ایک ناظر اور دست راست تھا جیسا کہ آج سے چند عشرے پہلے علاقے کا عام دستور تھا کہ کسب گر (نائی، ڈم، شاخیل، کمہار وغیرہ) کو گھر اور کھیت خریدنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی کیونکہ پھر پشتون سوسائٹی کی خدمت براری کی بجا آوری میں رکاوٹ کے غالب عنصر کا احتمال موجود نظر آتا تھا لیکن خان بابا نے علاقے کی رسم سے ہٹ کر اسے وفاداری کے انعام میں رہنے کے لئے گھر اور زراعت کے لئے کھیت دے دیں۔حالانکہ بعض علاقوں میں آج بھی کسب گروں کو مذکورہ چیزیں خریدنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

عشیزے بابا نے اگرچہ بانسری بجانا چھوڑ دیا ہے لیکن افیون کی ٹکیوں سے ناطہ توڑنا اسکے بساط سے بھی باہر معلوم ہوتا ہے اور ہر وقت وہ افیون کا دانہ منہ میں رکھ کر قرار پاتا ہے۔

مارتونگ علمی بانڈہ کا علمی و ادبی گھرانہ

فنون موسیقی کے علاوہ شعروادب کے میدان میں علاقہ چغرزی لمبی تاریخ اور علمی داستان کا حامل چلا آرہا ہے، اسکے سینہ پر بے شمار خاوندان مکتب نے جنم لیا ہے۔ جن میں کافی تحقیق کے بعد جس عظیم شخصیت کا نام آتا ہے وہ تپہ اسماعیل خیل کا سپوت عظیم دینی پیشوا اور صوفی شاعر فضل احد بابا ہے۔ جو کہ چودھویں صدی ھجری کے ابتدائی تین عشروں کا جہاندیدہ رہا ہے۔ آپ کے اسلاف کسی زمانے میں تپہ اسماعیل خیل سے ہجرت کر کے مارتونگ کے عالمی بانڈہ نامی بستی میں مقیم ہو چکے ہیں اور آج تک انکی اولاد اس علاقے کا علمی اور روحانی خاندان کے نام سے جانی جاتی ہے۔ فضل احد بابا کو پارسائی اور بزرگی اور روحانی فیض وراثت میں ملی تھی۔ وہ فنافی اللہ صوفی بزرگ تھے۔ آپکے کلام میں صوفیانہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ کا منظوم قلمی نسخہ انکی اولاد کے پاس محفوظ چلا آرہا ہے جس سے یہاں نمونے کے طور پر یہ شعر پیش کی جاتی ہے۔

فضل غواڑم بیا احسان لتا احدہ

طرفین م دوڑمی مصرعے نامہ دہ

آپکا جد امجد تراب بابا ولد آدم بابا بھی اپنے زمانے کے ولی اللہ اور ممتاز عالم دین اور صوفی بزرگ ہو گزرے ہیں۔ آپ نے آج سے ایک سو ساٹھ سال پہلے قرآن کریم کا جو نسخہ ورثے میں چھوڑا ہے۔ وہ یقیناً عظیم دینی خدمت اور بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ مذکورہ قلمی نسخہ انکی اولاد کے پاس موجود ہے۔ راقم نے خود ملاحظہ کیا ہے۔ اس نسخہ کو قلم اور کاغذ کے حوالہ کرنے میں راقم بابا کی اولاد سے بابا کی فکرمندی اور کاریگری کی جو داستان سُنی وہ الگ باب ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں پہلے توت کے جڑوں کو اکھٹا کیا پھر صاف کر کے اُنہیں کوٹ کوٹ کر گرم پانی میں جوش دیا اور آگے

جا کر مختلف مراحل سے گزارنے کے بعد کاغذ کی تیاری ہوئی اسی طرح سیاہی بنانے میں بھی بابا نے دیہاتی ٹیکنالوجی اور مواد کو استعمال میں لایا اور یوں یہ قلمی نسخہ منصۂ شہود پر لانے میں کامیابی حاصل کی جو کہ چغرزی کے مٹی پر دینی خدمت وادب کا عظیم شاہکار اور اعزاز ہے۔ کہتے ہیں کہ تراب بابا اٹک کے حضرت جی صاحب کے مرید تھے۔ اپنے پیر کے طرف سے آپکو "شیخ" کا لقب ملا تھا اپنے پیر کے حکم سے اپنے علاقے تپہ اسماعیل خیل کی جاگیر چھوڑ کر دُور عالمی بانڈہ نامی بستی میں رہنے لگے۔ تراب بابا کا پڑپوتا اور فضل احد مولوی صاحب کا بیٹا عبدالروف صاحب (پیدائش ۱۳۳۹ ہجری) اپنے والد کے وفات کے بعد ہندوستان گئے اور وہاں علم دین حاصل کرنے لگے۔ تحصیل علم کے دوران آپ نے حکمت کے دنیا کے مایہ ناز اتالیق حکیم اجمل خان کی شاگردی بھی اختیار کی۔ اور ایک مستند حکیم فارغ ہو کر ممتاز عالم دین کے ساتھ ساتھ ماہر حکیم و معالج وطن واپس لوٹ آئے۔ اور درس تدریس کے ساتھ ساتھ حکمت کے کام میں لگ گئے۔ مگر حاکم وقت (ریاست سوات) کی دربار میں اپکے خلاف شکایت کی گئی اس پر آپ کے خلاف انکوائری ٹیم تشکیل دیا گیا جسمیں ریاست کے ماہرین معالج کی ٹیم مولانا محمد ابراھیم (مؤلف فتویٰ ودودیہ) کی نگرانی میں اپکا امتحان لینے بٹھایا گیا۔ ٹیم نے آپکی قابلیت اور دانش کو دیکھ کر حکمت کے میدان میں اسے مستند قرار دیا گیا۔ اور یوں ریاست کے طرف سے آپکو اجازت نامہ مل گیا آپ نے دنیائے حکمت میں ایسے عجیب اور نادر نسخوں کا اضافہ کیا جس نے آج کے جدید دور کے حکماء اطباء اور ڈاکٹروں کو ورطہ عقل میں ڈال دیا آپ کے چھوڑے ہوئے نایاب نسخوں سے آج بھی رب کریم کینسر اور کئی دوسرے لاعلاج مریضوں کو شفاء کاملہ سے نوازتے ہیں۔ مولانا عبدالروف کو وفات ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہے۔ لیکن آپکا فرزند اور ممتاز عالم دین مولانا ولی اللہ صاحب نے آپکی میراث کی گدی سنبھالی ہے۔ اور ہزاروں کے تعداد میں پاکستان کے کونے کونے سے مریض آکر یہاں شفاء کاملہ پاتے ہیں آپ کا دواخانہ اور گھر ایک طرح سے دُعاؤں کا آستھانہ، خوراک وغیرہ کا مہمانہ خانہ اور علاج معالجہ کا دواخانہ ہے۔

حکیم ولی اللہ صاحب کے دوسرے بھائی اور مولانا عبدالرؤف کے بیٹوں نے علم ودانش کی گدی سنبھالی ہوئی ہے۔ اور اس خاندان کی موجودگی پوری علاقے کے لئے کسی بھی رحمت سے کم

نہیں ۔کافی عرصہ پہلے اس خاندان کا چشم وچراغ اور ممتاز عالم دین حسن بابا نے دین مبین کی سر بلندی اوراعلاء کلمۃ حق کی خاطر یہاں سے ہجرت کر کے شیر گڑ مردان میں مستقل سکونت اختیار کی تھی جہاں اُنکا گھرانہ بہت مشہور بزرگ اور علمی

گھرانہ ہے آج بھی خیبر پختونخوا کے کونے کونے سے دُعاؤں کے لئے جوق در جوق لوگوں کے قطارے آپکے آستانے پر حاضری دیتے ہیں اور دُعاؤں اور برکتوں کے سوغات لیکر واپس ہوتے ہیں حسن بابا کا بیٹا مولانا محمد احمد جو کہ 2009 میں 110 سال کے عمر میں فوت ہو چکے ہیں بہت برگزیدہ اور بزرگ ہستی تھی۔دور دور سے لوگ آپ کے آستانے پر دُعاؤں کے لئے حاضر ہوتے تھے آج آپکے بیٹوں میں مولانا محمد قاسم جے یوائی فضل الرحمن کے پلیٹ فارم سے منتخب MNA،اپنے والد کے دارالعلوم کے مہتمیم اور ہزاروں شاگردوں اور علماء کا حلقہ رکھتا ہے

عالمی پانڈہ اور شیر گڑہ کے اسماخیل پتہ سے متعلق اس بزرگ اور علمی گھرانے کا شجرہ نسب کتاب ہذاہ کے آخر میں دیا گیا ہے مولانا فضل احمد نے اپنے نسب کو اپنے کلام میں یوں بیان کیا ہے۔

مُلایم اسما عیل خیل د بیخا نئی
عبث عمرم تیرشود خُوانئی
دگناہ راتہ پرتے دی زولنئی
د نیکی راسرہ نشتہ دولتونہ
زما نوم فضل احد دے فضل غواڑم
ربہ ستا پہ در کسے ہمیش ژاڑم
دیدار م کڑے نصیب چہ ھلتہ لاڑشم
ہم د پا ک رسول شفا عتونہ

مغربی چغرزئی کے ادبی حلقے میں مولانا فضل احد صاحب کے بعد سب سے پہلا جس شخصیت کا ذکر ملتا ہے۔اور سب سے پہلے صاحب دیوان مانے جاتے ہیں۔وہ تپہ اسماعیل خیل سے تعلق رکھنے والا میرہ گئی کا حاجی محمد خان (مرحوم) ہے۔وہ تین کتابوں کے مصنف ہیں۔جو کہ مختلف

اصناف پر مشتمل ہیں۔انکے نام یہ ہیں ''یوسانگہ درے گلونہ'' منظوم قیصوں کا مجموعہ ہے۔دوسری کتاب ''نیمبولا او خاپیرئی'' اور تیسرا مجموعہ ''درے ملغلرے'' نامی کتاب ہے۔جو کہ بالترتیب قیصوں اور رُباعیات،مصروں اور لوبو پر مشتمل ہیں۔اُنکے کلام میں روانی،سلاست اور میٹھاس وجود ہے۔ بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہے۔جبکہ غزل کا شاذ ونادر تجربہ دیکھنے کو ملتا ہے جو نہیں کے برابر ہے۔آپکا کلام اُس وقت کے مشہور گلوکاروں وحید گل اور فضل قیوم نے خوبصورت آواز سے گایا ہے آپ کے ریکارڈ کی گئی منظوم قیصوں میں سب سے مشہور قیصہ جو آج سے تقریباً تین عشرے پہلے ریکارڈ کیا گیا ہے۔چغرزئی کے عوام بڑے بڑے شوق اور غور سے سُنتے ہیں۔ جناب حاجی محمد خان کے ہمعصر اور اِس علاقے کا ایک اور عوامی اور انقلابی شاعر زید اللہ خان معصوم صاحب ہے۔جو اپنے مترنم آواز، انمول وضع قطع،باغ وبہار طبعیت،نشیلی آنکھوں اور مُڑے ہوئے تاؤ مونچوں کے سبب چھوٹے اور بڑوں میں یکساں مقبول ہے۔

25 جنوری 1946 میں بٹاڑہ میں ذوتہ خان کرم خیل یوسف زئی کے گھر پیدا ہوئے۔ایم اے پشتو، اُردو اور اسلامیات میں پشاور کے عظیم علمی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہیں۔جبکہ لسان العربی میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے سند یافتہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل کر چکا ہے۔عمر کا کافی حصہ حصول تعلیم کی تلاش میں مردان میں مقیم رہکر گزارا ہے۔عملی زندگی میں مختلف عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ وزارت داخلہ اسلام آباد میں بطور Assistant فرائض انجام دی ہیں،وزارت اطلاعات و نشریات میں اسسٹنٹ انفارمیشن عہدے پر رہ چکے ہیں۔اسی طرح وزارت دفاع میں بھی بطور ASO اسلام آباد میں ایمانداری اور جانفشانی سے خدمات نبھا چکے ہیں۔اور آج کل ''پشتو سانگہ'' ڈگر کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے تعلیم وتدریس کے شعبے سے منسلک ہیں۔آپ کے زندگی کے بے شمار گوشے ہیں اور ہر گوشہ اپنے اندر ایک وسیع دنیا رکھتا ہے علاوہ ازیں زید اللہ خان صاحب بونیر کے ''پشتو محفل لیکوال'' کے سر پرست اعلیٰ بھی رہ چکے ہیں اور آج کل ''بونیر پشتو ادبی جرگہ'' کا سر پرست اعلیٰ بھی ہے ۔شاعرانہ ذوق بچپن ہی سے آپ نے اپنے ساتھ لایا ہے۔یہی وجہ ہے۔کہ

انتہائی میٹھے آواز سے نوازا ہے جہاں بھی ادبی محفل سجتی ہے۔اسکی ساری رنگینی اور سارا خمار آپ کے آواز میں ضم ہوکر سارے محفل کو لوٹ لیتا ہے اور داد وافرین کے لائق ٹھرتے ہیں۔اس طرح دوست واحباب کی خوشی کے تقریبات میں آپکی ظریفانہ گفتگو اور شگفتہ روئی کو زیادہ محسوس کیا جاتا ہے ۔پروفیسر صاحب کی اب تک 2 دو کتابیں ''پیغلہ مینہ'' اور ''بیاستر گے راواڑاوہ'' شائع ہو چکی ہیں ۔دوسری کتاب ''رازہ چی دواڑہ پہ ٹال زانگو زما د ٹال زانگل یاد یگی'' زیر طبع ہے اور مذکورہ دونوں کتابوں نے عوام میں خوب مقبولیت اور پذیرائی حاصل کی ہیں۔کتاب وقلم اور اہل قلم آپکا بہترین حلقہ یاراں ہیں۔جتنے ہی اس فقیر منش کے عمر کی طنابیں سکڑتے ہیں۔اتنی ہی آپ کے قلم میں تیزی اور تخیلات کا سمندر موجزن ہوتا رہتا ہے۔آپ نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہیں۔آپکا سارا کلام پند ونصیحت، حُسن وعشق اور صوفیانہ رنگ میں رنگ ہے آپکے کلام میں ہر قاری کی طبع اور مزاج کی جاشنی پائی جاتی ہے۔آپکی کتاب ''بیاستر گے راواڑوہ'' کے سرورق پر درجہ ذیل اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

اول اوگورہ خما د کتاب نوم
ملغلرے دی شعرونہ ذمعصوم
پہ نا مہ ذیداللہ خان دبٹاڑے دے
چغرزی کے دے خکارہ کلے معلوم

زیداللہ خان صاحب کے علاوہ سرزمین عُرف ماین برشمنال اور اسکے شاگرد ذاکراللہ!
س مٹی کے شعراء ہیں۔میخوچہ کے ارزومند خان کی غزلوں کو بھی معروف گلوکارہ نازیہ اقبال نے اپنی موسیقی کی زینت بنا کر عوامی مقبولیت حاصل کی ہے۔کراچی میں مقیم پردیس خان آف بٹاڑہ کے موسیقی کے کیسٹ بڑے شوق سے سُنے جاتے ہیں اِس طرح مسلم گل عرف بالا خان کی ساتھیوں سمیت حجرہ محفل پر مبنی موسیقی کے کیسٹ مسافروں کے دلوں پر مرہم پٹی لگتی ہیں۔اور اپنے وطن اور گلی کوچوں کی محبت کی یادوں سے بہرور ہوکر پھر مزدوری اور مسافری کے لئے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔چغرزئی

کی مٹی ہر لحاظ سے سونا اُگلنے کی صلاحیت سے معمور ہے۔سونا اسکی مٹی اور موتی اسکے ریت ہیں اسکا پانی اپنی تاثیر میں بے نظیر، جڑی بوٹیاں قدرتی دواخانے اور ہرے بھرے کھیتیاں رسیلی اور شاداب فصلوں کے باغات وکلیان سے معمور ہیں اور تا حد نظر شوخی ومستانہ روپ میں ملبوس وادی ہر چیز کو محو رقص بناتی اور اپنی گود میں لُھباتی ہے یہی حُسن تماشا کا معجزہ ہی ہے جو اپنے جگر گوشوں کے سینوں میں ترنم اور نغموں کی باراتیں جھومنے اور ناچنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور شعر وادب اور نغمہ گوئی کا یہ کارواں نئے شگوفے کھلنے اور نئے بہاروں کو جنم دیتے رہتے ہیں۔اور احمد فواد جیسے ماہر تعلیم اور آفاقی شہرت کے حامل شاعر، ادیب اور بہ یک وقت تین مختلف زبانوں میں اپنا لوہا منوانے والے کو جنم دیتا ہے۔احمد فواد صاحب کا تعلق مارتونگ چغرزی کے ایک شاخ بسی خیل سے ہے۔جھانزیب کالج میں انگریزی ادب کے اتالیق ہیں۔منفرد اسلوب اور کمال کے وضع قطع کے مالک یہ صاحب قلم کئی کتابوں کے مصنف اور اعلیٰ پائے کے تجزیہ نگار ہیں اُنکے کتابوں کے نام یہ ہیں (۱) دل ورق ورق تیرا (۲)۔کہ تہ راغلے زہ بہ گل شم (۳)۔یہ کوئی کتاب نہیں اور (۴)۔ایک جانب چاندنی۔

آباسین کے اِس پار (چغرزی) میں شعراء کا منظم ٹولہ 2007ء سے پہلے نہیں تھا۔اگرچہ شعراء کا بہت بڑا حلقہ موجود تھا۔اُنکے منظوم کلام یہاں کے حجروں اور خوشی کی تقریبات میں مقامی شوقین گلوکاروں اور موسیقاروں کی باہمی اشتراک سے موسیقی کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔اور پھر یہ ریکارڈ شدہ موسیقی کیسٹوں کے شکل میں نوجوان طبقہ علاقے اور مسافری میں اپنے پاس رکھکر بوقت ضرورت غور سے سُنتا اور اسی طرح اُنکا کلام چلتا پھرتا موسیقی کا روپ دھار لیتا تھا۔

شعراء کو ایک پلیٹ پر جمع کرنے اور ایک منظم شکل میں متحد کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹیں کھٹن اور دور افتادہ فاصلے اور علمی فقدان تھی۔یہی وجہ تھی۔کہ صحیح پلیٹ فارم مہیا نہ ہونے اور اُنکی شنوائی نہ ہونے کے سبب ایک تو بہت بڑا اثاثہ ضائع ہوا اور بہت سے شعراء کے حوصلے پست ہوکر پس منظر میں چلے گئے۔ 2007ء میں میرہ گئی کا ایک بیدار مغز جوان بخت بلند خان جو رحمت شاہ سائل۔زیداللہ خان معصوم اور قمراللہ خان قمر کیطرح مترنم آواز کے مالک اور اعلیٰ پایے کے شاعر ہیں نے کمر ہمت باندھ کر میدان میں کود پڑے اور چغرزی کے اِن بکھرے موتیوں کو ایک پلیٹ

فارم پر جمع کرنے اور منظم شکل میں پرونے کا تہیہ کیا۔ اور کافی حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔ لیکن ابھی 2 دو سال کا عرصہ نہیں گزرا تھا۔ کہ ملاکنڈ ڈویژن کی وادیوں میں خون اور آگ کے فوارے اور انگارے پھوٹ پڑے اور بم دھماکوں کے گرجدار آواز اور بارود کے بدبودار فضاؤں سے سارے وادیوں میں ہر ذی روح کے لئے سانس لینا مسئلہ بن گیا۔ ساتھ ساتھ آن ہی آن میں آبادیاں ویران اور کھیتیاں اُجاڑنے لگیں دم اور قدم دونوں شل اور ''ہاں'' و ''نا'' کو قابل گرفت و قابل قتل سزائیں قرار دی گئی، حقیقی زندگی کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا، نادیدہ قوتوں کے نادیدہ کارناموں نے ایک بھونچال اور محشر کی سی حالت کو جنم دیا۔ ایسے حالات میں اگرچہ ادبی کارواں اور قلم کے احباب کے ذہن وقلب اور تخیل کو قید نہیں کیا جاسکا البتہ اُنکے پاؤں کو پابہ جولاں اور طبعی پرواز کو ضرور ہتکڑیوں میں جکڑا دیا گیا جسکی وجہ سے یہ عظیم کام طویل عرصہ تک ملتوی ہونا پڑا 2011ء میں فیروزے کے جوانوں کی ضمیر ایک دفعہ پھر جاگ اُٹھی۔ بخت بلند خان کی قیادت میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور ''چغرزی ادبی جرگہ'' کے نام سے ادبی حلقہ کی بنیاد رکھ دی۔ بخت بلند خان کو اسکی سرپرستی کی ذمہ داری سونپ دی گئی، شوکت علی ٹوپی جہانزیب ٹوپی عبدالمناف ٹوپی، عظمت تنھا انخر میرہ، نصیب یار اور دوسرے جوان ادبی جرگہ کے متحرک اور فعال ارکان ہیں۔ اس ادبی جرگے کا مقصد باہمی تگ ودو اور تعاون سے پشتو ادب کی گلستان کی آبیاری، اتحاد واتفاق کا درس اور نسل نو کے عملی نگہداشت کے ساتھ ساتھ اپنے دھرتی اور مٹی کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہے۔ اس جرگے کے زیر سایہ چغرزی کے ادیبوں اور شعراء کو ایک ہی منظم شکل میں مجتمع کرنے کے لیے سرگرمیاں جاری ہیں۔ دریائے سندھ کے دونوں اطراف میں آباد ادبی ساتھیوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کر کے نہ صرف زبان وادب کے اس کارواں کو مضبوط بنایا جائے گا بلکہ قبیلہ چغرزی کو زندگی کے دوسرے بہت سے شعبوں میں ایک قدم ایک آواز ہونے اور یکجہتی کی علامت ٹھہرنے کا سنہری موقع بھی ہاتھ آجائے گا۔ اور اسی طرح اُنکی قبیلوی اور جغرافیائی شناخت خوب نکھر جائے گی۔

گوجر قوم

گوجر کا نام سن کر ذہن میں آجڑ کا کلمہ بھی فوراً اُبھرتا ہے۔ عام لوگوں کے خیال میں آجڑ اور گوجر دو مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حقیقت اسکے برعکس ہے۔ یہ دونوں ایک ہی نسل سے متعلق ہیں۔ دونوں کا تاریخ، تمدن اتار چڑھاؤ رسم ورواج، زبان اور ثقافت کا سرچشمہ اور منبع ایک ہے۔ البتہ زرعی پیشوں نے انہیں دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس قوم کے جو لوگ بھیڑ بکریاں پالتے اور خانہ بدوشانہ زندگی گزارتے ہیں وہ آجڑ کہلاتے ہیں اور جو میدان اور نیم پہاڑی علاقوں میں مستقل سکونت رکھتے ہیں گوجر کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ بہت قدیم اور وسیع آبادی رکھنے والی برادری ہے۔ ان میں ایک ہزار کے لگ بھگ گوت پائے جاتے ہیں۔ اپنے مخصوص طرز معاشرت، سینکڑوں زیلی شاخوں اور تمدنی ورثے کے آمین اس برادری پر قوم کا اطلاق ہوتا ہے۔ اِس بڑے قوم کا رشتہ محققین اور مورخین دنیا کے مختلف قوموں سے جوڑتے ہیں بعض کے نزدیک یہ آریائی قبائل کے مشہور قبیلے ''استا گیدی'' سے متعلق ہیں ہیروڈوٹس، بطلیموس اور دیگر بابل اقوام نے انکا ذکر استا گیدی اور ست گوسو سے کیا ہے۔ آریائی زبان میں ست کا مطلب 100 اور گوسو یا گیدی گائے کو کہتے ہیں۔ جسکا مطلب سو گائے رکھنے والے لوگ ہیں۔ لیکن شاہان گوجر کا مصنف مولانا عبدالمالک خان صاحب کے مطابق استا گیدی اور گاؤ چرا جیسے الفاظ سے بالکل متفق نہیں ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ گوجر خاندان یوچی ہے اور یوچی ستھین ہیں۔ اور چونکہ گوجر کو خزر بھی کہتے ہیں۔ اور بحیرہ خزر کو اسلئے خزر کہتے ہیں کہ اُس کے کنارے پر خزر ''گوجر'' آباد تھے۔ وہ مزید لکھتے ہیں۔

''بدھ مت کے عروج وزوال کے درمیانی عرصے میں یعنی ۲۴۲ ق م سے لیکر 500 سال تک ہندوستان لگاتار بیرونی حملوں کا دنگل رہا۔ باختر یونانیوں نے ستھین اقوام کو نکال دیا اور وہ پہلی

اور دوسری صدی ق م کے مابین وارد ہندوستان ہوئے۔ وہ یوچی قوم کے سردار گڈا مافیس اول کی فتوحات کو بیان کر کے لکھتے ہیں۔ کہ اُس نے اپنے چھوٹے چھوٹے قبائل کو منظم کر کے پہلی صدی ق م کے ابتداء میں ہندوکش سے ہوتا ہوا کشمیر کو مسخر کیا اور پنجاب میں قدم جمائے وہ لکھتے ہیں۔ کہ شاید یوچی قوم کی ہجرت جو کہ 174 ق م میں قرار دیا جاسکتا ہے سے پہلے بھی یوچی کا کوئی اور قبیلہ ہندوستان پہنچ گیا ہو۔ کیونکہ گوجروں کے ہندوستان میں قدیم الایام سے موجود ہونے پر وہ دلیل میں رام چندر جی کے مشہور تاریخی داستان کو پیش کرتے ہیں کہ جب سیتا کو راون لے گیا تو راجہ رام چندر کسکند ہا پہاڑی پر پہنچا وہاں ایک بہادر سے اُس کی ملاقات ہوئی جو ''بانر'' قوم سے تھا۔ اور راجہ سگریو کا مدار المہام تھا اُس نے اپنا نام ہنومان بتایا وہ اُسکو راجہ سگریو کے پاس لے گیا۔ جسکا ''گوت'' بھالوت'' تھا۔ یہ دونوں گوت آجکل گوجروں کے ہیں ''بانرا'' اور بھالوت'' قوموں نے رام چندر جی کو امداد دیکر راون کو پائماں کیا اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ راجہ رام چندر جی کا زمانہ 1500 ق م کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔

خیر الحکیم زئی اپنی کتاب ''دبر سوات تاریخ نسلی سیاسی اور سماجی جوڑ نسبت'' میں گوجر قوم کے تاریخی پس منظر، اُنکے مختلف شاخوں اور زبان پر روشنی ڈالی ہیں۔ اور اُنکے اور مذہب کے بارے میں صفحہ نمبر 37 پر امپریل گزیٹر کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں۔ یہ لوگ ہندی نژاد ہیں۔ بدھ مت اُنکا مقبول مذہب تھا یہ لوگ پندریویں صدی تک اپنے مقامی بادشاہوں کے زیرِ حکمرانی رہتے تھے یہ غیر پٹھان قبائل گوجروں، تورو الیوں اور گاوریوں کے اسلاف تھے جو آجکل دیر اور سوات کوہستان میں رہتے ہیں لیکن اکثر مؤرخین اِس بات پر متفق ہیں کہ گوجروں نے 1500 ق م تا 900 ق م کے دوران گرجستان جارجیا (روس) سے ہجرت کی اور افغانستان سے ہوتے ہوئے برصغیر پاک و ہند میں داخل ہوئے اسکے بعد گوجروں نے جس صوبے میں اپنی حکومت قائم کی وہ گوجروں کے نسبت سے گجرات کہلایا۔ ایک سروے کے مطابق گوجروں کے نام پر 500 سے زیادہ گاؤں اور قصبے گجرات گوجروں کے نام سے ہیں۔

گوجروں کے علاقائی لہجے اور نسل کے بارے میں ایک انگریز مصنف اپنی کتاب میں یوں لکھتے ہیں

"Report on the tribes of Dir,Swat & Bajor"

"The numerous and uniquitious race are the Gujars, who are found all over the country side. they are of hindustani Origin, probably, Jat or rajput. their own dialect resembles punjabi."

ماہرین لسانیات نے گوجر زبان کو انڈو آرین خاندان کی شاخ قرار دیا ہے۔ پنجاب (دونوں پنجاب) کے گوجر ایک صدی قبل تک گوجری بولتے تھے پھر رفتہ رفتہ یہ پنجابی زبان میں تبدیل ہوگئی۔ گوجر برادری محمود غزنوی کے حملے کے وقت راجہ گیرا کے رعایا میں سے تھے۔ راجہ گیرا کے رعایا میں بہت سے قبائل تھے اور ان میں سے ایک بڑا قبیلہ گوجروں کا تھا۔ جب اُس نے راجہ گیرا کو شکست دی اور یہاں اسلام کا بول بالا ہوا تو جن گوجروں نے اسلام قبول کیا وہ فاتح قوم کے غلام اور بیگاری (فقیر) بن گئے اور جو اپنے پرانے مذہب پر قائم رہے انھوں نے پہاڑوں کی راہ لی اور وہاں بس گئے۔

محمود کے دور تک پشاور سے لیکر قنوج اور بھڑوچ (بحیرہ عرب) تک اِس سارے علاقے پر گوجر حکمران تھے اور اِس علاقے کو ''گوجر دیش'' کہا جاتا تھا۔ گوجر برادری آپس میں گوجرو اور اجڑی جو کہ ہندی کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتی ہے۔ بولتے ہیں۔ جبکہ مقامی آبادی کے ساتھ پشتو میں باتیں کرتے ہیں جب وہ تذکیر و تانیث کا ادراک کیے بغیر پشتو بولنے لگتے ہیں۔ تو مقامی آبادی جلد ہی ان کی قومیت پہچان جاتے ہیں۔ البتہ جہاں اِس برادری سے متعلق لوگوں نے خیبر پختونخواہ میں عصری جدید تعلیم حاصل کی ہیں۔ وہ اپنے دوسرے برادری سے کافی بدل اور الگ نظر آتے ہیں۔

گوجری زبان کا ماخذ انڈو آرین زبان ہے آریا ہندوستان میں آنے کے وقت انڈک زبان بولتے تھے باقی زبانیں آریائی اور ہندستانی تہذیب سے وجود میں آئیں جن کو پراکرت کا نام دیا جاتا ہے اور اُنکی ایک شاخ ''آپ بھرنش'' بھی ہے۔ گوجری کا تعلق ''آپ بھرنش'' شاخ سے ہے۔

پانچویں صدی عیسوی میں گوجروں نے درجنوں ریاستیں قائم کیں۔ اس عہد میں اُنکی زبان سنسکرت

تھی۔ جب پراکرتوں کا ظہور ہوا تو گوجری زبان نے جنم لیا۔ یہ عمومی پراکرت گوجر قبائل سے منسوب ہونے کے باعث گوجری کے نام سے مشہور ہوئی۔ سوات، بُنیر، پونچھ، کشمیر اور ایبٹ آباد کے پہاڑی علاقوں میں یہ زبان اصل حالت پر موجود ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہاں دوسری زبانوں اور قبائل کا اختلاط نہیں کے برابر ہے۔

اگر گوجروں کی تاریخ، تمدن اور زبان وغیرہ پر غور کیا جائے تو یہ بات صادق آتی ہے۔ کہ اُنکا جنم بھومی اور ماخذ بھی اِن علاقوں یا قرب وجوار میں سے ہیں۔ جہاں سے آرین، ڈراوڑین اور مغل وغیرہ ہو کر آئے ہیں اور ہندوستان کے دور دراز میں پھیلے ہوئے ہیں گوجر برادری نے تاریخ کے بہت سے اُتار چڑاؤ دیکھے ہیں۔ اُنکی پر مشقت زندگی ہمیشہ جہد مسلسل میں گزرتی چلی آئی ہے۔ اور خیبر پختونخواہ میں اُنکے وہ سپوت جو جدید دنیا سے ناواقف اور اپنے ماحول کے خول سے ابھی نہیں تک نکلے ہیں۔ آج بھی چٹانوں، طوفانوں اور پہاڑوں سے برسر پیکار عمر کاٹتی ہیں۔ البتہ اپنی ثقافت، رسم ورواج اور اپنی تہذیبی خودمختاری اور آزادی میں خوددار اور قناعت پسند ضرور ہیں۔

آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے تک یہ حکمران اور طاقتور قوم کی حیثیت سے رہے ہیں۔ لیکن محمود آف غزنی کے فتح کے بعد انہیں کبھی چین کی نیند نصیب نہیں ہوئی ہے اور فقیری، دہقانی بیگار اور خدمت براری اُنکا مقدر بن چکا ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ کہ گوجر قوم آپس میں پیشوں نے دو گروہوں اجڑ اور گوجر میں تقسیم کیا ہے۔ اجڑوں میں وہی خانہ بدوشی کا آریائی وصف بدرجہ اتم موجود چلا آرہا ہے۔ یہ خانہ بدوشی کے زندگی گزارتے ہیں۔ بھیڑ بکریاں اور مال برداری کے لئے گدھے اور خچر پالتے ہیں ہر سال اکتوبر نومبر کے مہینے میں پہاڑوں کی چوٹیوں اور بانڈہ جات سے گرم میدانی علاقوں کی جانب بڑے بڑے ریوڑ وسمیت رواں دواں دیکھے جاتے ہیں۔ اور سردی کے پانچ چھ مہینوں کے لئے وہ یہاں کے صاحب جائیداد لوگوں سے مشترکہ پہاڑ یا زمین قلنگ پر لیتے ہیں اور مذکورہ مدت کے اختتام پر پھر اپنے بانڈہ جات کا رُخ کر لیتے ہیں۔ اُنکی واپسی کا پس منظر کسی نے ٹپے کی شکل میں یوں بیان کیا ہے۔

خاونده بیا دِ پسرلے کڑو
شینکے ٹوکیگی گوجر بیا بانڈو له زینه

انکے برعکس آجڑ میدانی علاقوں یا پہاڑوں میں مستقل سکونت رکھتے ہیں۔ اور مقامی آبادی کے پشتونوں اور دوسرے جاگیردار لوگوں کے مکانات میں رہتے ہیں۔ اُنکے کھیتوں کو سنبھالتے ہیں اور بدلے میں علاقائی رواج کے مطابق خدمت براری اور بیگار کرتے ہیں۔

بیان بریں کے علاوہ بھٹو دور میں جو معاشی انقلاب آئی مختلف ممالک سے اُس نے معائدے کئے اور خصوصاً اپنے عوام کے لئے خلیج، سعودی عرب اور ملائشیاء وغیرہ کے ممالک دروازے محنت مزدوری کے لئے واں کئے تو لاکھوں پاکستانی تلاش روزگار اور اقتصادی خوشحالی کی خاطر مذکورہ ممالک میں پھیل گئے۔ اور تھوڑے ہی مدت میں انہیں اپنے چھت، کھیت اور کلیان اور چادر و چاردیوری کے حقوق مل گئے اِس ضمن میں گوجر برادری کی محنت ومشقت مثالی رہی اور نتیجے میں بعض تو اپنے مکانات کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے حویلیوں، جاگیر و اور بنک بیلنس کے مالک بن گئے۔ لیکن جنہیں بیرون ممالک جانے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی وہ آج بھی وہی پرانے رسم ورواج کے اسیر اور اپنے اقاؤں اور مالکوں کے پنجہ استبداد میں جکڑے ہوئے زندگی گزارتے ہیں۔

جس طرح پشتون اور دنیا کے دوسرے قبائل مختلف تپہ جات اور زیلی شاخوں میں منقسم ہوتے ہیں اِس طرح گوجر بھی ایک ہزار کے لگ بھگ شاخیں یعنی گوت رکھتے ہیں۔ اور یہی گوت پنجاب اور پختونخواہ میں یا تو بالکل ایک جیسے ہیں یا الفاظ کے معمولی ہیر پھیر کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ جو کہ حقیقت میں ایک جان اور ایک قالب ہے۔ اُن کے چند شاخیں اور ذیلی شاخیں یہ ہیں۔ بجاڑ، بانٹھ، بھالوت، پھامڑا، پنڈار، تیتر وال، ٹویہ، ٹانک، چھاوری، جنجوعہ، چیچی، چوہان، چوہدری، راجپوت، راٹھور، نون، سیھڑہ یا سیر یا سلہر، قاچار، کائرہ، کوٹوال، کھٹانہ، کھرل، لنگاہ، بھٹی، گوندل، وٹو وغیرہ یہاں یعنی پختونخواہ میں مقامی آثر کیوجہ سے اُن کے یہ گوت اور شاخوں کے ساتھ مقامی اصطلاح جو کہ گوت کے ساتھ لگائی جاتی ہے۔ خیل کے شکل میں لگاتے ہیں۔ جیسا کہ چوانز خیل،

کندوخیل، اکوخیل، وغیرہ ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ قوم ایک منظم قوت کی شکل میں پوری پاکستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ سماجی، ثقافتی اور تاریخی لحاظ سے اُنکی اپنی شناخت ہے۔ قیام پاکستان کی تاریخ میں اس برادری کے بزرگوں اور اسلاف کا بڑا رول رہا ہے۔ جسکی سب سے بڑی وجہ سرزمین پنجاب میں یہ روز اول ہی سے خوب تعلیمافتہ، جاگیردار اور بارسوخ خاندان چلا آرہا ہے۔ چوہدری رحمت علی، حفیظ جالندھری، چوہدری فضل الٰہی اور فیروز نون، وغیرہ پاکستان کے تاریخ کے درخشندہ ستارے ہیں۔ اور سارے گوجر برادری سے تعلق رکھتے ہیں اسی طرح پاکستانی سیاست اور جمہوری انتخابی عمل میں اس قوم کی سرگرمیاں ہر دور میں متحرک اور پوری تندی کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔ اور مختلف سیاسی پلیٹ فارموں سے کانٹادار مقابلے کے سیاسی حریف بن جاتے ہیں۔ بلوچستان سے صوبائی وزیر محمد اسماعیل ہو یا وفاقی وزراء قمر زمان کائرہ اور چوہدری طارق کی بات ہو۔ اور یا پنجاب اسمبلی میں 41 منتخب ممبران اسمبلی سمیت سینئر وزیر تنویر اشرف کائرہ کا ذکر ہو سارے کے سارے گوجر قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں کشمیر کے 42 میں سے 23 ممبران اور چھ وزراء کا نسلی اور خونی رشتہ بھی اسی قوم کے ساتھ پیوستہ بیان کیا جاتا ہے۔ سیاست میں اپنا لوہا منوانے کے علاوہ انجمن گجراں اور گوجر یوتھ فورم پاکستان وغیرہ کے ناموں سے غیر سیاسی تنظیمیں چلاتے ہیں جنکا مقصد اور نعرہ تعلیم اور آگاہی دینا ہوتا ہے۔ غرض ہر شعبہ زندگی اور ہر محکمہ میں گوجر قوم کے افراد کا وسیع حلقہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس برادری کی کافی تعداد مختلف سیاسی پارٹیوں کے ایجنڈوں اور منشور سے سیاست کر رہے ہیں۔ لیکن اپنے نام کے ساتھ بڑے فخر سے اپنے گوت اور قبیلے کا نام ضرور لکھتے ہیں۔

البتہ ملکی سطح پر پسماندہ بھائیوں اور دوسرے سماج زدہ کمزور طبقات کے حقوق کا نعرہ بلند کرنے کا ایجنڈا لیکر جو شخصیت آج symbol کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ اور جو خیبر پختونخواہ کے گوجر برادری کا نمائندہ اور قائد مانا جاتا ہے۔ وہ ضلع بونیر کے بندوبستی علاقے چغرزئی کا باشندہ اور ریال نامی چھوٹی بستی کا لخت جگر فانوس گجر ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر آگے آئیگا۔

پنجاب میں رہتے ہوئے گوجر برادری کی زندگی کے وہی سادگی اور مٹھاس روشنیوں شہری رنگینیوں اور

چمک دمک نے لے لی ہے۔ جبکہ پختونخواہ کے سردروں میں رہنے والے یہی سپوت دنیائے سیاسیات اور دوسرے بے شمار بندھنوں سے آزاد قدرتی روح پرور ماحول سے حقیقی لطف اُٹھا رہے ہیں۔ اور اُنکی زندگی کی مسرتیں رنگینیاں اور دولت اُنکے مویشیوں، دودھ، دہی مکھن اور اصلی دیسی گھی میں رقص کناں رہتی ہے۔

''اخوند درویزہ بابا''

ضلع بونیر علم وفن اور تہذیب وثقافت کے لحاظ سے وہ خوش نصیب اور شفیق گہوارہ ہے جس نے اپنی جھولی میں ماقبل تاریخ سے لیکر آج تک بے شمار ایسے ایسے اتالیقوں، دانشوروں، دین مبین کی متوالوں اور انبیاء و بزرگان دین کو جھولا ہیں جن کی فیضانِ نظر اور کارناموں کی بدولت آج بڑے بڑے علمی حلقے، خانقاہیں اور دانش کدے مصروف عمل ہیں اور جنکی بدولت آج شعر و ادب اور علم و تحقیق کا قافلہ اپنا سفر جاری رکھا ہوا ہے۔ یہ سرزمین ہر دور میں بڑے بڑے سلاطین، فاتحین اور علماء و فضلاء اور بزرگان کا دل پسند اور محبوب ٹھکانہ رہا ہے۔ یہاں اپنی علمی، سیاسی، ثقافتی، روحانی پیاس بجھائی ہے اور دنیا نے انہیں اُدھیانہ اور گندھارا کی حسین وادیوں اور پگڈنڈیوں کی وجہ سے پہچانے ہیں۔ علاقہ بونیر اُدھیانہ کی منظور نظر اور زرخیز وادی ہے۔ رام چندر جی کی روحانی پیاس یہاں بجھی۔ سکندر اعظم نے ایلم کی مشہور چوٹی پر سوما کارس پیا تھا۔ محمود آف غزنی کا لشکر یہاں سے ہو کر گزرا۔ بدھ مت کی علمی، روحانی اور انسانیت دوست تعلیمات یہاں کی پہاڑوں اور میدانوں میں پھیلتی گئیں۔ ملندہ کا زرین دور یہاں کے در و دیوار میں پروان چڑھا۔ ساکا، ستھین اور ہُن بھی اس وادی کے حسن عشق میں گرفتار رہے۔ پیر باباؒ نے عبادت و ریاضت اور چلہ کشی کیلئے بونیر ہی کو من پسند علاقہ قرار دیا۔ اکبر اعظم کے لئے یہاں کے قبائل سب سے بڑی رکاوٹ بنی اور پہاڑی قبائلیوں کے تین بڑے گیٹ (امبیلہ، خدو خیل اور چکدرہ) کو قابو کرنے اور اُن کو محصور کرنے کے لئے بہت بڑا حملہ کیا۔ نتیجہ میں کڑاکڑ اور ملندری کے پہاڑ، کمین گاہیں اور عمیق کھائیاں اُن کے ہزاروں لشکریوں کا مقتل اور دائمی استقرار ٹھہرا۔ غرض اسی مٹی نے آئے روز انقلابی سوچ کے مالک اور حق پرست علماء کا ایک ایسا ٹولہ بھی پیدا کیا جو اپنی مٹی، اپنے قوم اور اپنے یوسف زئی سوروماؤں کے ساتھ ہر محاذ پر دشمن کے خلاف ڈٹے رہے۔ ان میں جداگانہ اسلوب کا مالک، عالم و محقق، وقائع نگار اور پشتون زبان و

ادب کا محسن اخوند درویزہ باباؒ ہے جو بونیر کی اسلامی تاریخ کا پہلا محقق، صاحب تصنیف اور پشتو نثر کے بانیوں میں سے ہے۔

پیدائش:

اخوند درویزہ باباؒ پر جتنے بھی محققین نے تحقیق کی ہے اور اُن کی زندگی کے متعلق جتنے بھی قلم اٹھائے گئے ہیں بیشتر اس بات پر متفق ہیں کہ اخوند درویزہ باباؒ کی پیدائش 940ھ میں ہوئی ہے۔ حیات پیر بابا کے صفحہ 157 پر شفیع صابر لکھتے ہیں ''گدائی نے پاپین کے شہزادوں کے خاندان کی ایک خاتون قراری بنت ملک نازو خان سے شادی کی۔ 940ھ میں اللہ تعالیٰ نے اس خاتون کو اخوند درویزہ سا بیٹا دیا''۔ بیشتر محققین اخوند صاحب کی پیدائشی مقام کے بارے میں علاقہ چغرزئی پر متفق ہیں لیکن یہ آج کے وقت کا علاقہ چغرزئی نہیں ہے۔ اُس وقت موجودہ چغرزئی کا علاقہ ڈوما کفار کے زیر قبضہ تھا۔ شیخ ملی تقسیم میں موجودہ سلارزئی کا علاقہ اُس قبیلہ چغرزئی کے حصہ میں آیا تھا اور پھر گرزندویش میں قبیلہ چغرزئی یہاں سے منتقل ہو کر مستقل ویش میں یہاں کے ہمیشہ کے لئے ہو گئے۔ میاں عبدالرشید اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں لکھتے ہیں: ''حضرت اخوند درویزہ باباؒ 940ھ میں بونیر کے سلارزو میرہ گاؤں میں پیدا ہوئے اور وہی جوان ہوئے ہیں''۔ اخوند درویزہ باباؒ تاریخ میں اخوند درویزہ ہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آپ نے کسی بھی تصنیف میں اپنا دوسرا کوئی نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے بیٹے اخوند عبدالکریم جو کہ بہت بڑے عالم، ادیب اور شاعر ہیں نے بھی اپنے والد کو اگرچہ مختلف القابات سے یاد کیا ہیں لیکن اخوند درویزہ کے علاوہ دوسرا کوئی بھی نام نہیں لکھا ہیں۔ اس بارے میں سید تقویم الحق کاکاخیل مخزن کے مقدمہ میں یوں رقمطراز ہیں:

''پشتونوں میں ملنگ، کچکول، فقیر، قلندر اب بھی عام نام ہیں اور اسی زمانے میں تو اس قسم کے نام رکھے جاتے تھے۔ خدا جانتا ہے پشتون کیوں اخوند درویزہؒ کے لئے دوسرا نام ڈھونڈتے ہیں۔ بعض حضرات نے اس سلسلے میں عبداللہ یا اللہ داد نام تجویز کئے ہیں لیکن عبداللہ یا اللہ داد نام اخوند درویزہؒ کے ایک بیٹے کا نام ہے اور باپ بیٹے کے نام سے اپنا نام نہیں رکھتے''

مکہ سے مدینہ اور اسی طرح انقرہ (ترکی) سے ہوتے ہوئے بلخ، ھرات، لغمان اور ننگرہار سے ہوکر خیبر پختونخواہ آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اجداد نے اپنے ناموں کے ساتھ بلخی، لغمانی، مدنی، ھراتی، ترکی، بخاری وغیرہ نسبتی نام لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے خاندان نے ننگرہار میں کافی عرصہ گزارا ہے تو علاقائی محبت کی سبب آپ نے اپنے نام کے ساتھ ننگرہاری بھی لکھا ہے۔ اسی طرح بعض مورخین نے پشاور میں آپ کے قیام کی نسبت اخوند درویزہ پشاوری لکھا ہے۔

خاندانی پس منظر اور نسب:

اخوند درویزہ باباؒ کا شجرہ باپ کی طرف سے خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ تک پہنچتا ہے جو کہ آپؓ کے بیٹے حضرت آبان سے شروع ہوکر پشت در پشت اخوند درویزہ باباؒ تک پہنچتا ہے۔ حضرت آبان، حضرت عثمانؓ کے آٹھ بیویوں میں سے پہلی بیوی اُم عمرو بنت جندب بنت عمرو بن جمہ دوسیہ کا بیٹا تھا۔ جو حضرت عثمانؓ نے دور جہالیت میں کئے تھے۔ حضرت آبان عراق، بغداد کے موصل نامی شہر میں والئی تھے۔ عبدالمالک بن مروان بن امیہ کے دور خلافت میں وفات پا چکے ہیں۔

اخوند درویزہ باباؒ فرماتے ہیں کہ میرے آباؤ اجداد بہت زمانہ پہلے ترک سے آئے تھے، بلخ، کابل، لغمان اور سلاطین بلخ اور داودزئی اور پاپین کے ساتھ قیام پذیر اور گھل مل گئے ہیں اور اگر کوئی میرے نسب کے متعلق جاننا چاہتا ہے تو انقرہ، استنبول او

رترکی کے بادشاہ سے معلوم کریں۔ (تذکرہ، میاں عبدالرشید)۔

بعض لکھاری اور محققین اُسے تاجک ظاہر کرتے ہیں تو بعض آپ کو ترک لکھتے ہیں۔ عبدالحلیم اثر افغانی ''روحانی ترون'' میں لفظ تاجک کے متعلق مشہور مورخ میگتینز کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ تاجک۔ طائب قوم کے لوگ آرئین ثائی (عربی طائبان) یعنی سبائی نسل کے لوگ ہیں۔ جو 500 قبل مسیح سے اس علاقہ میں آباد تھے۔ اور افغانستان میں دیگان اور وادی پشاور کے قدیم تاریخ میں دھقانان کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ شمالی اور مشرقی افغانستان کے وادی کنڑ، لغمان، کوہستان، ریزہ، کوہ دامن، تگات، بخراب، پنج شیر وغیرہ کے علاقوں میں اندراب تک کے علاقے میں تقریباً 21 لاکھ کی تعداد میں ایک ساتھ آباد ہیں اور سویت

روس کی ریاستوں میں تاجکستان کے نام سے ایک علاقہ اس قوم کے لوگوں کا موجود ہے جو اشتراکی نظام کے زیر انتظام ہے لیکن مسلمان ہیں اور نسلاً عرب ہیں اور جنوب عرب سے آئے ہوئے ہیں۔

اخوند درویزہ بابا (لغوی اعتبار سے اخوند کے معنی سکالر، محقق اور دانشور کے ہیں) کا چھٹا دادا جیون لغمان میں رہتے تھے۔ آپ کا بیٹا متہ ننگرہار کے مہمند درہ میں آباد تھے۔ آپکا بیٹا احمد ننگرہار کے علاقہ شنوار و علاقہ پاپین میں رہا کرتے تھے۔ آپ کا بیٹا جو کہ شیخ سعدی کے نام سے مشہور ہے بھی پاپین میں رہتے تھے۔ اخوند درویزہ کے مطابق جیون بن جنتی کابل کے مشرق میں درہ مہمند میں اقامت گزیں تھے۔ وہ اصل میں قندوز کے رہنے والے ترک تھے اور بلخ کے ترک حکمرانوں کی قرابت دار تھے۔ جب مہمندوں سے کوئی تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا تو بلخ کے حکمرانوں نے اُن کی مدد کی اور وہ ننگرہار کے سردار قرار پائے۔

اخوند درویزہ بابا ماں کی طرف سے سلاطین بلخ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الابرار ولاشرار'' کی صفحہ نمبر 114 پر اپنا شجرہ یوں بیان کیا ہے: ''قراری (والدہ ماجدہ) بنت نازو خان بن ملک بابو بن سلطان قراہن بن سلطان خواجہ بن سلطان تومنا بن سلطان بہرام بن سلطان کہجامن بن سلطان ہندو بن جرس بن سلطان جمار۔ سلطان جمار، سلطان شموس کی اولاد میں ہے اور سلطان شموس، سلطان سکندر ذوالقرنین کی اولاد میں سے ہیں۔'' اخوند درویزہ بابا نے اپنی ماں کا شجرہ بیان کر کے سلطان سکندر ذوالقرنین لکھا ہے، سکندر مقدونی نہیں لکھا ہے۔ لیکن بعض محققین نے اندھی تقلید اور سرسری مطالعہ کا سہارا لیکر سکندر ذوالقرنین کو سکندر مقدونی لکھ کر اخوند درویزہ بابا کو یونانی ثابت کرنے کی لاحاصل سعی کی ہے۔ حالانکہ اگر تاریخی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مذکورہ دونوں شخصیات کے زمانے میں تقریباً دو صدیوں کی طویل مسافت ہے۔ ذوالقرنین کے عروج کا زمانہ 549 ق م ہے جبکہ مقدونی تقریباً دو سو سال بعد یعنی 324-356 میں گزرا ہے۔ سکندر ذوالقرنین کا ذکر سورۃ الکہف میں سولہویں پارے میں تفصیل سے آیا ہوا ہے۔ ''د پیر روخانہ تر د باچا خانہ پورے'' نامی کتاب میں موصوف نے اخوند درویزہ بابا کو مورد الزام ٹھہرا کر کچھ یوں لکھا ہے اور خود اپنی کم فہمی کا ثبوت دیا ہے:

''

او خپل شجره نسب د سکندر اعظم یونانی پورے تړی ، یعنی د پلار له طرفه تاتاری مغل او د مور له طرفه یونانے دے چی دغه په خپله تضادی خبرے دی۔تاجك آرین دے او ترك مغل حان ته انسانی ذات دے چی دغه یو بل سره سمون نه خوری۔او بل دا سکند اعظم په ۳۳۲ ق م کے پختونخوا ته راغلے وؤ ۔ او اخوند درویزه ۱۹۶۸ کاله پس پیدا شوے دے، داسے معلومیگی چی اخوندرویزه په دروغه د هغه وخت دوه نامتو نسلونو نه حان جوڑ کړے دے۔''

اس بارے میں موصوف کی خدمت میں صرف اتنا عرض ہے کہ پشتون اسلاف کے کارناموں پر کتاب لکھ کر واقعی بہت بڑا کارنامہ اور قومی خدمت ہے لیکن اُس کے لئے یک رُخی اور اندھی تقلید اختیار کرنا اور کسی کے اجداد کو بے جا ہدف تنقید بنا کر کسی بھی مصنف یا محقق کی شایان شان ہے نہ خاوندانِ قلم کی تقدس اور شان کے مناسب ہے۔

اخوند درویزہ باباؒ کے دادا نے یوسف زئی کے ساتھ ہجرت کر کے دوآبہ پشاور آئے اور شیخ ملی تقسیم میں آپ کے خاندان کو 30 افراد کے حساب سے اراضی ملی۔ سید تقویم الحق کاکاخیل کی تحقیق کے مطابق ۹۶۰ھ کے لگ بھگ سوات اور بونیر فتح کرنے کے بعد شیخ ملی نے زمینوں کی تقسیم کی تو سعدی کو ان کی خدمات اور بزرگی (مشری) کے انعام میں تیس افراد کا احصہ اراضی علاقہ ملیزئی میں مند قبیلے کے ساتھ دیا گیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سعدی کو قوم میں ملکی (سرداری) کی حیثیت حاصل تھی۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ یوسف زئی جب اس وطن میں آئے تو ملک احمد اور شیخ ملی کے ساتھ اخوند سعدی ہمراہ تھے انہوں نے اراضی کی تقسیم میں مندیزی کے ساتھ حصہ دیا۔ بعد میں چغرزئی نے اپنی طرف کھینچا اور سترہ افراد کا حصہ انعام میں دیا۔ شیخ سعدی اپنے موت تک چغرزئی کے ساتھ رہے۔ مندیزی اور چغرزی دونوں ملیزی کی شاخیں ہیں اور شیخ ملی نے دیر کے اردگرد آباد کئے ہیں۔''روحانی تڑون'' میں اخوند درویزہ بابا کے خاندانی سفر کو بیان کر کے عبدالحلیم آثر افغانی لکھتے

ہیں۔

''جب 812ھ میں یوسف زئی وغیرہ قبائل کے لوگ کابل سے ننگرہار کے راستے وادی پشاور کی طرف کوچ کر رہے تھے، ان کے ساتھ سعدی جو تاریخ میں شیخ سعدی کے نام سے مشہور ہے پشاور آئے تھے اور جب یوسف زئی کے قبائلی قائد ملک احمد خان اور دوسرے قبائلی سرداروں نے بالاتفاق 821ھ تا 829ھ مشہور پشتون قانون دان شیخ ملی نے مفتوحہ علاقوں کی تقسیم تمام قبیلوں کے مابین افراد کے حساب سے کیا تو شیخ سعدی کو مندیزی قبیلہ موجودہ پشاور کے قریب تحصیل چارسدہ دوآبہ کے علاقہ میں ''خیالی'' اور ''سردریاب'' دریاؤں کے درمیان خیالی کے مشرقی کنارے ''سریخ'' اور ''مروزے'' نامی دیہاتوں کے قریب آباد ہو چکا تھا کہ اس قبیلے کے نام کی نسبت سے ایک گاؤں اب بھی مندیزی سے مشہور ہے۔حضرت شیخ سعدی وہاں آباد ہو چکے تھے اور بعد میں وہاں ایک جھگڑے میں شہید ہو گئے''۔

تبصرہ: تقویم الحق کاکاخیل کی تحقیق حقائق پر مبنی ہے اور آپ نے جو چغرزئی، مندیزی کی قبیلوی نسبت بیان کی ہے وہ تو اس حد تک ٹھیک ہے کہ مذکورہ دونوں شاخیں ملیزی سے متعلق ہیں کیونکہ ملی بن یوسف کے چار بیٹے دولت زئی، عیسوڑے، آبازی اور چغرزئی ہیں اور پھر مندیزی دولت کا بیٹا اور چغرزی کا بھتیجا ہے اور اسماعیل زئی کا بھائی ہے لیکن وہ دیر کے اردگرد آباد ہوئے تھے اس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ چغرزئی، مندیزی بونیر ملیزی سے متعلق ہیں دیر ملیزی سے نہیں۔ بونیر ملیزی چغرزئی اور مندیزی کا شجرہ بالترتیب یہ ہے: چغرزی بن ملی بن یوسف اور مندیزی (منڈے زی) بن دولت بن ملی بن یوسف ہیں۔ جبکہ دیر ملیزی کا جد امجد اکو بن یوسف کی نسل سے ہیں اور اُس کا شجرہ یوں ہے۔ملی بن خواجہ بن اکو بن یوسف ہے۔ دیر کے ملیزی دادا اکو اور بونیر کا ملی (ملیزی) دونوں بھائی ہیں اور یوسف کے بیٹے ہیں جبکہ اسماعیل خیل اور اسماعیل زئی میں بھی فرق ہے۔ایک اسماعیل جس کی اولاد اسماعیل خیل سے مشہور ہیں۔ اسماعیل بن فیروزے بن بختور بن چغر بن کاملی بن یوسف کی اولاد ہیں اور اسماعیل جس کی اولاد کو اسماعیل زئی کہتے ہیں اسماعیل بن دولت بن ملی بن یوسف کی اولاد ہیں۔ دوسری جانب ''روحانی تڑون'' کی تحقیق سے نہ تو

تاریخی لحاظ سے اتفاق ممکن ہے اور نہ جغرافیائی تقسیم کے حوالہ سے۔ ایک تو شیخ ملی کی تقسیم میں یوسف زئی کو جو حصہ ملا ہے وہ مردان، صوابی، خدوخیل، چملہ، دیر، بونیر اور شانگلہ وغیرہ میں ملا ہے۔ ہشتنگر اور چارسدہ محمد زئی کے حصہ میں آیا تھا اور دوآبہ، نصف باجوڑ، دانشکول وغیرہ گگیانی قبیلہ کو دیئے گئے جس کے مقابلے میں عبدالرشید نے اپنی کتاب میں جو تحقیق کی ہے وہ نظر قارئین ہے اور وہ مبنی بر حقیقت ہے۔

''ان دنوں شیخ سعدی گدر حمزہ خان میں مقیم تھے۔ آگے لکھتے ہے کہ حضرت شیخ سعدی شہید بابا کا مزار مردان کے بالاگڑھی، شہبازگڑھی کے پل سے تھوڑے فاصلے پر غربا سڑک کے جنوبی کنارے بالاگڑھی کے گاؤں میں ہے، شہید بابا کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ وہ آگے مزید لکھتے ہیں کہ شیخ سعدی بابا کا بیٹا اخوند گدائی کسی وجہ سے مندیزی قبیلہ سے ناراض ہوئے۔ ایک گرزندہ ویش کے موقع پر چغرزئی اسماعیل خیل نے اخوند گدائی کو بونیر کے تورورسک کے شمال مشرق کے دس افراد کے حساب سے سیری اراضی دیا اور اخوند گدائی بونیر کے جعفر غر کے شمالی دامن میں سالارزومیرہ نامی گاؤں میں مقیم اور سکونت پذیر رہے۔ جعفر پہاڑی جو کہ عائشہ زئی اور گدیزئی بونیر کا حد فاصل پہاڑ ہے کا ذکر اخوند درویزہ بابا نے اپنی کتاب تذکرۃ الابرار والاشرار میں کیا ہے۔

شہبازگڑھی، بالاگڑھی میں اخوند خیل کی کافی اراضی تھی اور زروئی سیری کے نام سے مشہور تھی۔ اخوند خیل اسلام پور نے تقریباً تین عشرے قبل فروخت کی ہے۔ شہبازگڑھی کے پشتونوں اور اخوند خیل اسلام پور کے درمیان ماضی میں کافی روابط رہ چکے ہیں بلکہ وہ رشتہ اور تعلق اب بھی کسی حد تک قائم ہے۔ دوسری بنیادی حقیقت جو اس بارے میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ تورورسک سے نکل کر شرقاً بنڑ (جنگل) کے اُس پار جو علاقہ ہے وہ اخوند درویزہ کو حصہ میں ملی تھی۔ جس کا سوات سٹیٹ دور تک اخوند خیل اسلام پور باقاعدہ 60 روپیہ دونوں فصلوں بطور قلنگ وصول کرتے تھے۔ بعد میں پل کے ساتھ زیریں ایک حصہ 25 ہزار روپے پر فروخت کیا۔ کچھ عرصہ بعد باقی ماندہ زمین کی فروخت کی بات جب چل پڑی اور وہاں کی ایک پشتون خاندان کے ساتھ بات طے ہوئی تو مقامی پشتون برادری نے اس پر اپنے حق ملکیت کا دعویٰ کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے جس پر اخوند خیل اسلام

پور نے مہابت خان صوبیدار میجر کے نام ڈگر میں کیس دائر کیا۔ اُس وقت تاج محمد خان آف غالیگے حاکم ڈگر تھے اور کیس کے مختیار صوبیدار میجر نے ریاستی امور میں مصروفیت کی سبب اپنے داماد میاں بہادر جان اخوند خیل کو مقرر کیا۔ غورے بابا اور شمسی خان آف ایلئی جو کہ پشتون شناس اور روایات کے امین، زورآور اور نامی گرامی خوانین اور معززین علاقہ تھے نے اس کیس میں اخوند خیل کا بھرپور ساتھ دیا اور رب کریم کی خصوصی کرم اور اُن کی خصوصی دلچسپی اور تعاون سے فیصلہ اخوند خیل کے حق میں آ گیا۔ اُنہیں اپنے حصہ اراضی کی فروخت کی اجازت مل گئی۔ بعد میں یہ اراضی جو کہ گیدڑوں تنگے کے نام سے مشہور ہے تورورسک کے ایک رئیس پر تقریباً 60 ہزار روپے پر فروخت کیا۔

اسی طرح سالارزئی میں اخوند خیل کی جو اراضی تھی اور غالباً اخوند درویزہ باباؒ کے پوتے میاں نور محمد کو بطور سیری ملی تھی، اُس کی بھی وہ سالانہ 60 روپے وصول کرتے تھے۔ یہ قلنگ کافی عرصہ میانگل سرور بابا آف سالارزومیرہ اخوند خیل وصول کرتا تھا۔ اور پھر اسلام پور لے جا کر برادرز اخوند خیل کے تین پتہ جات آپس میں تقسیم کر دیتا۔ آخر جوڑ کے پشتون برادری نے اس پر تورورسک کے پشتون برادری کی طرح اپنا حق ملکیت جتا کر قلنگ دینے سے انکار کیا جس پر اخوند خیل اسلام پور اور سالارزئی کے درمیان ریاستی دور میں کیس چلا اور نتیجہ میں والئی سوات کے فیصلہ کے مطابق جوڑ کے پشتون برادری کو ساٹھ اوگے (پیمانہ اناج) وربشے (جو) دینے کے پابند بنا دیئے گئے لیکن جب 76-1975ء میں پٹوار آیا اور زمینوں کے مستقل الاٹمنٹ اور وراثت کا مرحلہ آیا تو اُس وقت اخوند درویزہ بابا کی اولاد خواب خرگوش کے مزے لوٹتے رہے بلکہ تن آسانی اور بے اتفاقی کی نظر ہو کر آپس میں تذبذب اور انتشار کے سبب اس طرف کوئی توجہ نہیں دے سکے حالانکہ سالارزئی کے بعض خیر خواہ اور قریبی تعلقداروں کے مکمل تعاون اور سہارا بھی انہیں حاصل رہا۔ لیکن مدعی سست گواہ چست کے مصداق اُن کا بھی آخر جذبہ ٹھنڈا ہوا اور اخوند درویزہ بابا کی اولاد کو ایک بڑے تاریخی ورثے، شناخت اور قیمتی اثاثے سے ہاتھ دھونا پڑا اور آج میاں پٹے جو کہ جوڑ کے مشرق میں واقع ہے اور آدھا ڈھنڈ حجرہ جن پر آپ کی اولاد کبھی نازاں اور حق ملکیت رکھتی تھی اُن میں وہ پردیسی، بے اختیار اور اجنبی ہیں۔ ''روحانی تڑون'' کے تاریخی تحقیق کی طرف آتے ہیں جو تاریخی لحاظ سے قابل

عمل نظر نہیں آتی کیونکہ مرزا الغ بیگ 1872ھ بمطابق 1469ء میں بادشاہ بن گیا تھا۔ یوسف زئی قتل عام 1891ھ بمطابق

1488ء کے لگ بھگ واقع ہوئی اس کے بعد باقی یوسف زئی ملک احمد کی قیادت میں کابل، غوڑہ، مرغہ سے ننگر ہار اور ننگر ہار سے پشاور، مردان وسوات وغیرہ آئے اور پشاور میں 910ھ کو پہنچے۔ دس سالہ جنگ کے بعد 920ھ کو سوات آئے اور 17، 18 سالہ جنگی مہم کے بعد شیخ ملی نے 938ھ بمطابق 1530ء تقسیم (ویش) کی۔ عبدالحلیم اثر نے ''روحانی ترون'' میں جو قصہ لکھا ہے اُس میں یوسف زئی ہجرت، پشاور آمد اور شیخ ملی تقسیم کی جو تواریخ بیان کئے گئے ہیں، تاریخی اعتبار سے اُن میں کم از کم 80 یا 108/109 سال کا فرق موجود ہے۔

ابتدائی عمر سے تحصیل علم تک:

قرائن تاریخی حوالوں اور خود اخوند صاحب کے اقوال سے ثابت ہے کہ اخوند درویزہ بابا کی پیدائش قبیلہ چغرزئی کے ساتھ ہوئی ہے جو اُس وقت ایک گرزندہ ویش میں آج کے سالارزئی کے علاقہ میں مقیم تھے۔ سالارزئی میرہ میں آپ کے والد محترم کی وفات ہوئی، وہاں آج بھی آپ کا مزار موجود ہے اور میرے بابا کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کے دل میں خوف خدا اور دین سے محبت پیدائش سے رچ بس چکی تھی۔ یہاں تک کہ آپ کی زبان ابھی باقاعدہ طور پر اظہار کی طاقت بھی حاصل نہیں کر چکی تھی کہ آپ کے دل میں خوف وہیبت کی کیفیتیں گزر جاتی۔ جب چلنے پھرنے کے قابل ہونے لگے تو شکار کے شوق نے بھی اُسے بے قرار کیا لیکن آپ کا یہ شوق، بے قراری اور تجسس ساتھ ساتھ رہی۔ اپنی کتاب ''تذکرۃ الابرار والاشرار'' کی صفحہ نمبر 120-119 پر اپنا قصہ یوں بیان کرتا ہے:

''ایک روز میں اپنے دوستوں کے ساتھ کوہ جعفر کے مشرقی جانب نکلا اور ایک درخت کے نیچے کمین گاہ میں شکار کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ میں تیر کو ظاہری طور پر کمان میں چڑھائے ہوئے تھا۔ لیکن میری روحی توجہ اُس سے غافل تھی، میں اسی حال میں تھا کہ دو سفید ریش اشخاص، عصا ہاتھ میں لئے پہاڑ پر سے اُتر کر اچانک میرے سامنے آئے اور انہوں نے کہا کہ احسن الخالقین ورب العالمین، یہ

کہہ کر وہ غائب ہو گئے۔ چونکہ میں اُس وقت الف، ب بھی نہ جانتا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے کیا کہا لیکن یہ بات مجھے یاد رہی اور میں نے اُس کا تذکرہ اپنے استاد مخدومی ملا مصر احمد سے کیا جو سید محمود ولی بخاری کی اولاد میں تھے۔ انہوں نے پوری کیفیت سن کر فرمایا کہ اے فرزند دلبدن! میں نے رات خواب میں دیکھا کہ تم ایک خطرناک دریا میں غرق ہو رہے ہو، ہر چند میں نے تم کو اس دریا سے نکالنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارے لیکن میں جتنی بھی کوشش کرتا اُتنی ہی تم غرق ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ میں تم کو نہ پا سکا۔ میری والدہ (قراری) اُس خواب کی تعبیر کو سوچ کر بہت پریشان ہو گئی اور خوف زدہ ہو گئی۔ حضرت مخدومی ملا احمد مصر نے فرمایا کہ میرے اس خواب کی تعبیر اور تمہارا مشاہدہ آپس میں مطابقت رکھتے ہیں۔ اگر تم طلب علم میں کوشش کی تو تم اس بلند مرتبہ پر فائض ہونگے کہ ہم سے اور اپنے زمانے کے اکثر علماء سے سبقت لے جاؤں گے۔ یہ سن کر اُسی وقت میری والدہ نے تھوڑا سا میوہ حضرت مولانا مصر احمد کی خدمت میں پیش کیا اور حضرت ملا مصر احمد نے ایک تختے پر حروف تہجی لکھ کر مجھے دیئے اور مجھے پڑھانا شروع کیا۔ اُسی دن سے میں نے نماز عشاء تک سات مرتبہ قواعد وحروف تہجی کو سیکھ لیا، آٹھویں مرتبہ ابجد کو پڑھا یہاں تک کہ میں نے سمجھ لیا کہ احسن الخالقین ورب العالمین کا یہ کلمہ، کلمات علم میں سے تھا۔ اُس کے بعد ہر روز میں دو سورتیں پڑھتا یہاں تک کہ میں نے ایک سال میں پورا قرآن مجید چند کتابوں کے ساتھ پڑھا اور پھر مخدومی مصر احمد مجھ سے تحصیل علم کرنے لگے۔ خدا کا فضل میرا شامل حال تھا جو کچھ سنتا، میرے حافظہ میں پتھر کی لکیر ہو جاتا اور میں اُسے نہیں بھول سکتا تھا''

تحصیل علم کے سلسلہ میں اخوند صاحب ملا سجر پاپینی کے شاگرد رہے۔ ملا تور بابا کے حلقہ علم وشاگردوں میں رہے۔ علم کی پیاس اور حلاوت نے اُسے ہندوستان میں ملا جمال الدین کی صحبت اور شاگردوں کی سعادت نصیب کی۔ کچھ سال وہاں رہنے کے بعد ماورائے للنہر یعنی بخارا گئے اور شیخ بہاوالحق سے علم حاصل کی۔ وہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد کافرستان کے راستے کشمیر آئے اور وہاں ملا عباسی نامی ایک عالم دین سے فیض حاصل کرنے لگے۔ ملا عباسی طریقت اور سلوک میں بہت بلند مقام کے مالک تھے۔ اُس سے طریقت کے اسباق حاصل کئے۔ اس دوران شیخ یعقوب کشمیری کی

شرف ملاقات حاصل کی اور ساتھ ساتھ بونیر کے الیاس زئی قبیلے کے ملا یوسف سے ملے۔ جو اُن دنوں شیخ یعقوب سے علم حاصل کرتے تھے۔ اُس نے اخوند صاحب کو پیر بابا کی بونیر آمد اور درس و تدریس شروع کرنے کے بارے میں بتایا۔ یہ سن کر اخوند درویزہ بابا فوراً اپنے وطن بونیر روانہ ہوئے اور اپنے پرانے استاد ملا سجر پاپینی کے پاس چلے گئے۔ پیر بابا سے ملاقات کے لئے اُس کی سفارش طلب کرنے کی استدعا کی اور اسی طرح اُسے اپنے استاد کے ذریعہ پیر بابا سے ملاقات کی شرف نصیب ہوئی۔ پیر بابا نے اُسے طریقت کے وضایف دیئے اور کچھ عرصہ بعد اُسے اپنا خلیفہ ماذون مقرر کیا۔ پیر بابا کی وفات یعنی 991ھ تک وہ بونیر میں تھے۔

ہجرت:

مغل بادشاہ اکبر جب یوسف زئی پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا تو اخوند صاحب اپنے ملیزی ساتھیوں سمیت ہجرت کرنے پر مجبور کر دیئے گئے، اُس وقت پیر بابا کی وفات کو تقریباً تین سال گزر چکے تھے کہ اکبر نے زین خان کو اور راجہ بیربل کی قیادت میں لشکر 994ھ/1585ء روانہ کیا۔ اس ہجرت کے دوران جو اخوند صاحب نے اپنے ساتھیوں سمیت کیا اُنہیں سخت مشکلات اور موسمی خراب حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور کئی دل خراش اور خون چکا مناظر دیکھے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ سوات کے سرحدی درہ میں اتنی لاشیں دیکھی کہ کسی کو دفنانے کی طاقت نہیں تھی۔ جو بھی مردار پاتا حلال کی طرح کھاتا اور اگر نہیں پاتا تو جان دے دیتا اُن پر اتنا ظلم روا رکھا گیا کہ اُن کا لکھنا ادب کے خلاف ہے۔ اُس ہجرت میں اُن کا ارادہ اور منزل سوات تھا تاہم سوات کے بجائے انہوں نے غوریا خیل کی راہ لی۔ وہ کہتے ہیں کہ جس وقت ہمارا ملک ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور ہر طرف یوسف زئی کو لوٹ لیا گیا تو میں پھر بھی ملیزی کے ایک ٹولے کے ساتھ سوات کے دروں میں سے ایک درے میں داخل ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ایسا تھا کہ ساری رات بارش اور ژالہ باری نے آلیا۔ خیمے بھی نہیں تھے اور قریب المرگ تھے لیکن صبح سورج نکلا اور جان میں جان آ گئی۔

اس میں شک نہیں کہ اکبر کی فوج پہاڑی یوسف زئی کے مقابلہ میں کمزور تھی اور سوات کے حسین پہاڑ اُن کے قبضہ میں نہیں آئے لیکن مغل فوجوں نے اُن کا بدلہ سمہ کے یوسف زئی سے

لے لیا اور اُن کے ساتھ جو کیا وہ ناقابل بیان اور ناقابل تحریر ہے۔

آخر اخوند درویزہؒ نے مجبور ہو کر اپنے اہل و عیال سمیت خود کو مغل کے قبضہ میں دے دیا۔ انہوں نے ہمیں دوآبہ اور ہشتنگری لے آیا۔ عبدالبصیر نعمانی نے اپنی کتاب ''خزینۃ الانبیاء'' میں اخوند درویزہ کی ہجرت کے بارے میں کچھ یوں تحریر کیا ہے:

''جب مغل اکبر یوسف زئی پر تاراج کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا تو اخوند درویزہ بابا بونیر سے اسلام پور ہجرت کر کے منتقل ہوئے۔ جب مغل نے دیر، سوات، باجوڑ اور بونیر پر قبضہ کیا تو یوسف زئی جلاوطن ہوئے اور پشاور گئے۔ یہ جلاوطنی بارہ سال پر محیط تھی۔ بارہ سال بعد مغل یوسف زئی کے علاقوں سے نکل گئے اور یوسف زئی اپنے علاقوں کو آ رہے تھے تو اخوند درویزہ بابا پشاور کے ہزارخوانی ہی میں رہ گئے''۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یوسف زئی بھی ان بارہ سالوں میں آرام سے نہیں بیٹھے بلکہ ہر وقت مغل پر عرصہ حیات تنگ کیا اس لئے وہ مجبور ہو کر انہیں وطن واپس آنے کی اجازت دی۔ دوسری بات یہ ہے کہ پہلا ہجرت اخوند درویزہ باباؒ نے اپنے اہل و عیال سمیت سوات کی بجائے غوریا خیل کو کیا ہے اور پھر وہاں سے نقل مکانی کر کے اسلام پور میں سکونت اختیار کی ہے۔ آپؒ نے جس درہ کا ذکر کیا ہے وہ درہ مرغزار ہے جو بہت زرخیز اور حسین وادی ہے۔ اس میں اسلام پور سب سے بڑا گاؤں ہے جو اخوند درویزہ بابا کے پوتے اخوند میاں نور کی اولاد کا دیہات ہے۔ اس کے ساتھ تقریباً 2 کلومیٹر کے فاصلہ پر اونچائی پر واقع سپل بانڈئی نامی گاؤں ہے۔ یہاں بھی اخوند درویزہ باباؒ کے پوتے اخوند میاں دولت بابا کی اولاد آباد ہیں۔

اخوند درویزہ باباؒ پشاور میں رہ گئے اور وہاں تالیف و تصنیف میں مصروف ہونے لگے۔ میاں ظاہر شاہ کی کتاب کے صفحہ نمبر 79، 80، 93 کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اخوند کریم داد بارہ سالہ جلاوطنی کے بعد یوسف زئی کے ہمراہ پشاور سے واپس ہوئے اور دیر میں شیادئی نامی گاؤں میں ٹھہر گئے۔ وہاں کے حمزہ خیل کے ایک بزرگ نے اسے اپنی بیٹی نکاح پر دے دی۔ کچھ عرصہ بعد سوات کا نجو آئے اور اپنی شہادت تک وہاں رہے۔ آپ کا عبداللہ نامی بھائی اُس وقت اسلام پور میں

تھے۔اخوند عبدالکریم کی شہادت کے بعد اپنے بھتیجوں میاں نور محمد جو کہ اُس وقت سید ابولا مودودی کے جد امجد حضرت شیخ آدم بنوری کے ساتھ مدینہ میں مقیم تھے اور آپ کا بڑا بھائی میاں دولت دہلی شہر میں تھے کو واپس بلایا اور اپنے گاؤں اسلام پور لے آیا۔اس بیان سے مزید وضاحت ہوتی ہے کہ اخوند درویزہ باباؒ کے ساتھ اُن کے دو بیٹے اخوند کریم داد اور عبداللہ شامل تھے۔

وفات:

اخوند درویزہ باباؒ کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی عمر سے نوازا۔آپ نے تقریباً 108 سال کی طویل عمر پائی اور 1048ھ کو پشاور کے گنج دروازے سے جنوب مشرق کی جانب موضع ہزار خوانی کے نزدیک ایک بڑے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔آپ کی وفات کے بارے میں بعض عناد پرست اور نام نہاد لکھاریوں نے حقائق سے چشم پوشی کر کے مختلف افسانے گڑھ لئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی وفات طویل عارضہ دمہ کی بدولت واقع ہوئی ہے جو جانبر ثابت نہ ہوسکی اور آپ کی روح قفس جسدی سے پرواز کر گئی۔ روشن خان نے اپنی کتاب سرگشت یوسف زئی میں صفحہ 86-485 پر بابا کے بارے میں تیل پینے اور آپ کی وفات کے متعلق جو افسانے گھڑ لئے ہیں ان میں ذاتی عناد اور بُغض کے علاوہ کسی بھی قسم کی صداقت نظر نہیں آتی۔ 107 سال کی عمر میں کسی عالم دین اور مجتہد و محقق کی دعوتوں پر جانا اور بسیاری خوری سے کام لینا جس طرح ممکن ہوسکتا ہے؟ دوسرے واقعہ میں اخوند صاحب کی پیاس کا قصہ نہایت بھونڈے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔جس میں اخوند درویزہ کو پیاس لگی ہوئی ہے،ایک عورت جس کے سر پر تیل کا گڑھا ہے،کو آواز دیتا ہے،وہ رُک جاتی ہے،سر سے تیل کا گڑھا اُتار کر اُن کے سامنے رکھتی ہے،وہ تیل کا سارا گڑھا پی لیتا ہے،اُن کو کچھ ہوتا ہے،نہ صحت پر اثر پڑتا ہے اور نہ وہ عورت یہ گوارا کرتا سمجھتی ہے کہ بتائے کہ یہ پانی نہیں تیل ہے۔روشن خان کی روح سے مودبانہ اور معذرت خواہانہ عرض ہے کہ وہ اس طرح کی بے بنیاد، منگھڑت اور عقل و شعور سے ماوراء حوالوں کو اپنی قیمتی اور تاریخی کتاب میں کیسے اور کس بنیاد پر جگہ دیتا تھا؟ اور مذکورہ حوالہ جات نقل کرتے وقت تاریخی اور زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر تدبر و تفکر سے کیوں کام نہیں لیا؟

﴿بایزید اخوند اختلافات﴾

شفیع صابر لکھتے ہیں:

''اکبر اور جہانگیر کے عہد میں آزاد خیالی اور ملحدانہ نظریات نے عام مسلمانوں کے بنیادی عقائد کو بری طرح متاثر کیا تھا۔لوگ ارکان اسلام پر عمل پیرا ہونے کی بجائے فروعی اختلافات اور موشگافیوں میں وقت ضائع کر رہے تھے۔تناسخ اواگون،
جادو ٹونے وغیرہ کے ہندوانہ نظریات مسلمانوں میں بھی عروج پا رہے تھے۔دینی تعلیم کے مدرسوں کا انتظام تھا نہ تبلیغ اسلام کی منظم کوشش،ایسے میں اگر پیر باباؒ،اخوند درویزہ باباؒ،اخوند پنجو اور ان کے دوسرے ہم عصر فروغ و اشاعت اسلام کے لئے میدان میں نہ نکلتے تو صورت حال بڑی ناگفتہ بہ ہوتی''۔

اخوند درویزہ باباؒ کی حیثیت یوسف زئی میں ایک استاد، مصلح اور روحانی پیشوا کا تھا۔ سوات، بونیر، دیر، باجوڑ، چترال اور کوہستانی علاقوں کے علاوہ مالاکنڈ ایجنسی کے لوگ اُس زمانے میں مولانا اخوند درویزہ باباؒ اور اُن کے خاندان کا بے حد احترام کرتے تھے اور زندگی کے تمام مسائل اور معاملات میں اُن کی رائے اور مشورہ پر عمل کرتے تھے۔بظاہر یہ علاقے آزاد تھے لیکن تنازعات اور اختلافات میں مولانا اخوند درویزہ باباؒ کے علمی و مذہبی شخصیت کی وجہ سے مطیع فرمان تھے۔وہ عالم ہونے کے علاوہ ایک طرح بے تاج بادشاہ تھے۔مولانا نے اپنی زندگی گزارنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا،وہ گوشہ نشین صوفیاء کا نہ تھا بلکہ چلتے پھرتے متحرک علماء و فضلاء کا تھا (بریکوٹی)۔

ایسے حالات میں ایک عالم کیسے ماحول سے آنکھیں چُرا کر خاموشی سے بیٹھ سکتے ہیں۔ دوسری جانب ان دنوں تحریک روشنائی کے نام سے ایک تحریک اُٹھی جس کی قیادت کانی گرام کے بایزید انصاری المعروف پیر روشن کر رہے تھے۔لیکن بعض اُمور پر اختلافات کی سبب دونوں مکاتب فکر ایک دوسرے کے مدمقابل میدان میں اُتر آئے۔یہاں تک کہ تحریک کے متوالوں کے درمیان

طویل رسہ کشی اور رزمیہ مہمات کے نتیجہ میں دونوں طرف بھاری جانی و مالی نقصان ہوا۔ بایزید اور اُن کے بیٹوں نے زندگی کی بازی ہاری۔

اخوند درویزہ باباؒ کے حلقہ نے بایزید کو پیر روشن کے بجائے پیر تاریک کے نام سے پکارا جبکہ دوسرے جانب بایزید انصاری نے بھی انہیں نہیں بخشا یہاں تک کہ اپنے تصنیف ''صراط التوحید'' میں نہ صرف اپنے والد کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا ہے بلکہ خود کو توحید پرست اور دوسروں کو مشرک قرار دیتے ہیں (حیات پیر بابا)۔

ان تحریکوں کے حلقہ اثر دو گروہ ظہور میں آئے اور دونوں ایک دوسرے کے مخالفت پر کمر بستہ ہونے لگے۔ بایزید کے متوالے اخوند صاحب کے متوالوں سے برسرپیکار رہے اور اخوند صاحب پر قسما قسم لیبل چسپاں کر کے خود کو قوم پرست اور محبّ وطن گردانتے ہیں لیکن اصل چیز جو معیار اور میزان مانا جاتا ہے اور جو ابدی خوشی کی ضمانت ہے اُس سے ہٹ کر شخصیت کا معیار اور توازن، گروہ بندی اور فرقہ پرستی گردانتے ہیں حالانکہ اگر دیکھا جائے تو بایزید انصاری کی تحریک کی بنیاد ہی سیاسی تھی نہ کہ مذہبی۔ جس کا اندازہ سید تقویم الحق کاکاخیل کے اس حوالہ سے بخوبی ہوتا ہے:

''ان چیلوں اور ریاضتوں میں اُس کا پُرانا اندوختہ ختم ہوا اور گھر کے لوگوں کی اجازت سے تجارت کی نیت سے قندہار روانہ ہوئے۔ راستے میں مغل کارداران نے اُن سے قافلے کے دو حصے مال چھین لیا۔ اُس نے بہرام خان کے دربار میں شکایت کی۔ اُس نے سرے سے اُس کی طرف کوئی دھیان نہیں دی۔ اُس کے دل کو بہت دکھ پہنچا۔ اُمراء کے دربار میں جانے سے توبہ کیا اور پانچ سال چیلہ کشی اختیار کی۔ اُس کے برعکس اخوند درویزہ باباؒ تو ابتداء سے اکبر بادشاہ کے خلاف تھے۔ آپ نے باقاعدہ اُن کے باطل عقیدہ کا برملا اظہار کیا ہے۔ اس بارے میں اخوند صاحب کچھ یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

لا رخنہ د دین دہ پاتے چہ بادشاہ زمونر اکبر وو
دے د نفس پہ لارہ تلے او لہ دینہ بے خبر وو

آپ کے باپ دادا یوسف زئی کے وفادار اور مغلوں کے مخالف رہ چکے تھے۔ یوسف زئی

کی رفاقت میں جیل کاٹی اور قربانی دی اور آپ کے خاندان کا مغل کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ آپ کے رشتے ناطے یا تو یوسف زئی کے ساتھ رہے اور یا سلاطین بلخ اور سیدوں کے ساتھ تھے۔ پھر بھی بعض حضرات عناد کی بنیاد پر اخوند درویزہ باباؒ اور آپ کے استاد سید علی ترمذی پیر بابا پر مختلف چھاپ لگاتے ہیں حالانکہ اگر دیکھا جائے تو بایزید نے مغل ہی کے خاندان میں اپنے بیٹے کے لئے رشتہ کیا تھا۔

بایزید کا پوتا احداد 1025ھ میں کو جہانگیر کو لکھتا ہے:

''تم بابر ابن عمر شیخ ابن ابوسعید کے پوتے ہو جبکہ میں بابر کی اپنی پھوپھی اور عمر شیخ کی اپنی بہن کا پوتا ہوں۔ اٹک سے نیچے ملک تمہارا اور اٹک سے شمال کی جانب ملک میرا۔ اُدھر کبھی دعویٰ بھی نہ کرنا''

علاوہ ازیں ماضی میں مغل کے ساتھ یوسف زئی کی رشتہ داریاں بھی ہو چکی ہیں۔ ملک سلیمان شاہ مرزا الغ بیگ کے سسرال تھے جبکہ بابر نے بی بی مبارکہ سے شادی کر کے اپنے لئے ہندوستان پر حملے کا راستہ ہموار کیا جس کے لئے اُس نے دولت خان لودھی کا تعاون حاصل کر کے ابراہیم لودھی کا تختہ اُلٹ دیا۔

اسی طرح قصوریہ پٹھان جو کہ لاہور کے جنوب میں آباد ہیں محمد زیوں کے خویشگی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں یہ روایت مشہور ہے کہ وہ بابر کے ساتھ اُس کی فوج میں بھرتی ہو کر آئے تھے اور بابر نے اُنہی کی خدمات کے صلے میں اُن کو وسطی پنجاب میں جا کر جاگیر عطا کی (دی ٹھیان 233)۔ علاوہ ازیں بایزید کا کونسا بیٹا مغل کے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔ خود بایزید تو طبعی موت مرا ہے۔ آپ کے بیٹے شیخ عمر اور خیر الدین دلازاکو کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ بایزید کا تیسرا بیٹا نور الدین وہاں سے بھاگ کر محمد زئی ہشتنگریوں کے جوانوں کے ہاتھوں قتل ہوا جبکہ آپ کے چوتھے بیٹے جلال الدین نے زخمی حالت میں دریائے سندھ پار آمان زئی میں پناہ لی۔ بعد میں مقامی آبادی کے ہاتھوں اُسے اکبر اعظم کے حوالے کر دیا۔ اُس نے اُسے بہت عزت کے ساتھ رکھا۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اپنے جانی دشمن کو کوئی اتنی عزت دے سکتا ہے حالانکہ اُس نے دربارِ مغل میں پناہ

نہیں لی تھی بلکہ اُسے بادشاہ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ جلال الدین بعد میں ہزارہ قبائل کے ہاتھوں قتل ہوئے اور یوں بایزید اور اُس کے بیٹوں کی داستان تمام ہوئی۔

پس محققین اور خاوندانِ قلم کے لئے ضروری ہے کہ دونوں شخصیات پر قلم اُٹھانے سے پہلے غیر جانبداری کا مظاہرہ کریں اور دونوں پر بے جا تنقید سے گریز کریں اس لئے کہ اُن دونوں کی اختلافات جیسے اور جس نوعیت کے ہوں دونوں پشتو ادب اور پشتون قوم کے محسن ضرور ہیں۔

تصانیف اور ادبی خدمات:

پشتو زبان کو تحریر اور قلم کی طاقت بخشنے اور علمی دنیا میں قوموں کے درمیان متعارف کرانے کا سہرا بایزید انصاری اور بونیر کے مایہ ناز اور زرخیز مٹی کے سپوت اخوند درویزہ بابا کے سر ہے۔ ان سے پہلے پشتو کو ایک کم مایہ ناز سمجھا جاتا تھا۔ اور تحریری سرمایہ صرف فارسی اور عربی ہی موجود تھا۔ سید احمد شاہ رضوانی "بہارستان" میں اخوند درویزہ بابا کی ادبی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اخوند درویزہ بابا پشتو ادب کے محسنین میں سے ہیں۔ انہوں نے پشتو زبان کے ارتقاء میں غیر معمولی حصہ لیا اور پشتو میں کتابیں لکھ کر اس زبان کو ترقی کی راہ پر ڈال دیا۔ اسی لئے ان کا نام پشتو زبان کے خدمت گزاروں میں ہمیشہ عقیدت سے لیا جائے" (شفیع صابر)

بریکوٹی صاحب نے مولانا اخوند درویزہ بابا کی زندگی پر تفصیلی کتاب لکھ کر بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے اور تالیف و تحقیق کے میدان میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں اخوند درویزہ بابا کی علمی شخصیت اور ادبی خدمات کے اعتراف میں لکھتے ہیں۔ "آج سے چار سو سال قبل اگر مولانا اخوند درویزہ بابا نہ ہوتے تو اس خطہ زمین کی روحانی اور مذہبی تاریخ سرے سے موجود نہ ہوتی"

اس کے علاوہ بریکوٹی صاحب اپنی کتاب مولانا اخوند درویزہ کے صفحہ نمبر 56 پر لکھتے ہیں "کہ حضرتا خوند درویزہ کی جلالت شان اور علم و فضل کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ راورٹی جس کا شمار پشتو ادب کے عالموں میں ہوتا ہے کا بیان ہے کہ افغانوں میں سب سے مشہور اور عالم بزرگ حضرت اخوند درویزہ ہی ہیں"

اخوند درویزہ بابا فارسی، پشتو اور عربی زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے تھے تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ بابا نے تصنیف و تالیف کا کام نقل مکانی کے بعد کی ہے۔ کیونکہ "تذکرۃ الابرار ولاشرار" لکھتے وقت آپ نے اپنی عمر 80 سال بتائی ہے اور یہ کتاب آپ نے 1021ھ میں لکھی ہے۔ تقویم الحق کا کاخیل کے مطابق آپؒ نے مخزن الاسلام، ارشاد الطالبین اور تذکرۃ الابرار و الاشرار 1012ھ/1403ء اور 1021ھ/1016ء کے درمیان لکھی ہیں۔ جبکہ ارشاد المرین کے متعلق بھی یہی اندازہ ہے۔ یہ ساری کتابیں آپ کے بڑے بیٹے عبدالکریم صاحب نے دوبارہ مرتب کی ہیں۔ ڈارمسٹیٹر کے مطابق اخوند درویزہ باباؒ نے کم و بیش 50 کتابیں لکھی ہیں ان میں مذکورہ بالا کتابیں اب بھی ملتی ہیں جبکہ باقی سرمایہ کتب دست برد زمانہ سے نہیں بچ سکے۔ آپ کے پوتے اخوند میاں نور محمد اور پھر آپ کے بیٹے غلام محمد بابا کے دور تک یہ سرمایہ کسی حد تک محفوظ رہا۔ شیخ ملی کا دفتر بھی اُن کے ہاں بحفاظت رہا۔ تقریباً آج سے تین/ چار عشرے قبل تک پشت در پشت کسی نہ کسی طریقے سے یہ محفوظ ہاتھوں میں بچا رہا۔ اخوند صاحب کے علاوہ اُن کے بیٹوں اور پوتوں کا خزانہ اُن کی نسل میں گردش کرتا رہا۔ آخر تقریباً تین/ چار عشرے پہلے اس عظیم اور قیمتی خزانے کا بڑا حصہ اسلام پور کے طالعمند اخوند خیل کے حصہ میں آیا۔ اُس نے اُسے بوریوں میں بند کر کے سردخانے کی نذر کی۔ آخر علمی بیگانگی، جاہلیت اور ناقدر شناسی کی سبب پتہ نہیں کیسے ضائع کر دیا اور کن کن کے ہاتھوں کتنے ٹکوں اور دوسرے لالچوں کے عوض فروخت کیا گیا۔ شیخ ملی کا دفتر بھی جو اُس کے پاس تھا غالباً ریاستی دور میں یا ریاست کے ادغام کے بعد چناڑ کے ایک نامی گرامی اور علاقہ کے معزز خان امیر جول خان بابا جو مذکورہ اخوند خیلی کا معتمد خاص اور قریبی دوست تھے کے خاندان کا ملندری کی جائیداد میں مردان والوں کے ساتھ تنازعہ اُٹھا۔ جس پر قاضی صاحب کو دفتر شیخ ملی کی ضرورت پڑی۔ جسے جناب امیر جول خان بابا نے طالعمند اخوند خیل سے وصول کی۔ بعد میں پتہ نہیں کہ شیخ ملی کا یہ دفتر کس کے ہاتھ تھما دیا گیا اور کس کے پاس محفوظ رہی یا کہ دست برد زمانہ کی دیمک چاٹ گئی۔ اُن کے علاوہ اسلام پور میں اخوند درویزہ بابا کی اولاد میں ایک خاندان نے قلمی سرمائے کو ایک باجوڑی عالم دین مولوی شیر زمان جو اسلام پور میں مقیم ہے کے ہاتھ تھما دی۔ آج تک اُن کے پاس

محفوظ ہیں لیکن وہ اُن سے استفادہ کی اجازت دینا تو درکنار اُن کے فوٹو کاپی دینے سے بھی کتراتے ہیں۔ اور اگر یہی حالت رہی تو یہ سرمایہ بھی یا تو سردخانے کے نذر ہو کر دیمک چاٹ جائیگی اور یا چند ٹکوں اور دنیاوی نمود و نمائش کی خاطر کسی سامراجی لائبریری کی زینت بن کر ہم اور ہی کنگال رہینگے۔

اسی طرح اخوند صاحب کے ہاتھ کا قلمی نسخہ مائیکل میسکیو نامی ایک انگریز جو کہ سوات سٹیٹ دور میں پاچا کلے پیر بابا میں لیپروسی ہسپتال کا انچارج تھا، نے یہاں کے ایک موصوف سے حاصل کیا اور اس کے بدلے اُسے صرف کیمرہ دیکر وقتی طور پر اُس کی تسلی اس بات پر کی کہ جب وہ اُسے لندن لائبریری کے حوالہ کریگا تو آپ کا حوالہ دونگا اور اسی طرح وہ کتاب کے ساتھ ''بشکریہ فلاں'' کا لیبل لگا کر محفوظ کرینگے۔ مرزا عبدالرشید جو کہ بہت بڑے دانشور، محقق، ماہر نباتات و آرکیالوجی تھے۔ راقم کے تحریر و تحقیق و تالیف کے اتالیق بھی رہے۔ 30 اپریل 2011ء کو وفات پا چکے ہیں، وہ کہتے ہیں:

''میں نے اس کتاب ''قلمی نسخے'' کو بچشم خود دیکھا ہے اور پڑھا بھی ہے۔ آپ نے اُس کتاب سے ایک شعر بھی نقل کیا ہے جو نظر قارئین ہیں:

املک ملک ماست کہ املک خدا اوست
درویش ہر کجا کہ میرود سرائی اوست

ترجمہ: جو اللہ تعالیٰ کا ملک ہے وہ میرا ملک ہے، فقیر جہاں جائے وہ اُس کا سرائے بن جاتا ہے۔

علاوہ ازیں بابا کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن کریم کا نسخہ سالار حاجی صاحب اسلام پور کے ہاں محفوظ ہے۔ اسلام پور ہی میں ایک قلمی نسخہ باچا گل صاحب کشرخیل اخوندخیل کی اولاد کے پاس محفوظ چلا آرہا ہے۔

اخوند درویزہ باباؒ بہت بڑے مکتب کے خاوند تھے۔ آپ نے اپنے پیچھے بہت بڑی علمی تحریک اور وسیع ادبی حلقوں کو چھوڑ کر آج اُن کے فیض سے ہزاروں علمی کتب، تراجم، رسائل اور شعر و ادب کے کتب منظر عام پر آچکے ہیں اور آئے روز اُن میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اخوند صاحب اور

بایزید انصاری کے آپس میں مخاصمت و مجادلہ اگر ایک طرف اُس وقت کی فضاء کو سوگوار اور دونوں حلقوں میں ایک قسم بدنظمی اور نفرت پر مبنی جیسے ماحول کو جنم دیا تھا تو دوسری طرف بحیثیت مجموعی قوم سکوت اور سناٹے کے خول سے نکل کر اُن میں تجسس، تحقیق و تالیف اور قوت گویائی و اظہار کا مادہ اُبھار کر اُن کے مخفی صلاحیتیں منظر عام پر اُبھرنے لگے اور یہاں سے اُن میں ایک قسم سماجی سوجھ بوجھ اور سیاسی و تمدنی بصیرت جو اُس وقت اُن کے سینوں اور دماغوں میں قبائلی خودسر نظام کی بدولت دبی ہوئی تھیں، عملی طور پر نمودار ہونے لگیں۔ پشتو ادب کا دامن قیمتی فن پاروں سے بھر گیا۔ پشتو نثر اپنی ارتقائی سفر کے لئے قدم کی رفتار میں تیزی لانے لگے اور پشتو ادب میں مختلف اصناف سخن میں اضافہ ہونے لگا۔ یہ اُن دونوں کی تحریک کا نتیجہ تھا کہ آج تک دونوں حلقوں کے متوالے اور مکاتب فکر شعر و ادب کے میدان میں نت نئے تحقیقی مقالات و مضامین اور شعری مجموعوں کی ترتیب و تدوین کرتے ہوئے اپنے قلم کی نوک میں وقتاً فوقتاً تیزی لا رہے ہیں۔

پشتو زبان میں آج کل جو دنیا کے کونے کونے پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ علم و فن، تاریخ، جغرافیہ، سائنس و ٹیکنالوجی، تہذیب و ثقافت اور سیاسیات اور ملکی و بین الاقوامی سطح پر کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اور پشتو مایہ ناز زبانوں کی قطار میں نمایاں نظر آتی ہے۔ آج تک اس میں مختلف علوم و فنون کے تراجم ہو چکے ہیں۔ دنیا کی کئی زبانوں میں پشتو ادب کے تراجم موجود ہیں۔ مشرق و مغرب سے علوم کا بڑا خزانہ ہماری زبان میں منتقل ہونے لگا ہے اُن کے ساتھ عربی و فارسی کے بہت سے کتب اسلامی شرح ہائے اور تفاسیر پشتو زبان میں ترجمہ ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ اور اسی طرح آسانی کے ساتھ پشتو کا ہر بچہ اپنی ہی زبان میں دین مبین کی فیض سے فیضیاب ہو سکتا ہے۔ اس کا کریڈٹ یقیناً اخون درویزہ باباؒ کے حصہ میں آتا ہے جو کہ پشتون قوم پر بہت بڑا احسان ہے۔ حافظ الپوریؒ فرماتے ہیں:

پختنو تہ اخون لارد دین رنڑا کڑہ
مرد و زن دی پہ خپل ځان بار د منت ردی

''عثمانیؓ اخوند خیل''

افغانی اخوند خیل کی طرح عثمانیؓ اخوند خیل بھی بہت بڑا اور تاریخی قبیلہ ہے۔ خیبر پختونخوا کے علاوہ افغانستان میں بھی کافی تعداد میں اس قبیلے کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ تاریخ میں ایسے بہت سے شخصیات جو کہ پشتون اور غیر پشتون برادری سے متعلق ہیں۔ اپنی علم پارسائی اور بزرگی کی بدولت اخوند یا خون نام پایا ہے۔ ان شخصیات میں اخوند پنجو بابا، اخوند سباک بابا، اخوند سالاک بابا، اخوند عبدالغفور بابا، اخوند الیاس اور اخوند درویزہ بابا کے نام قابل ذکر ہیں۔ لیکن صوابی، بونیر، دیر اور سوات اور پشاور وغیرہ میں جو اخوند خیل رہتے ہیں اور جن کے اسلاف کی بدولت اخوند خیل اُنکی قبیلوی اور نسبتی پہچان بن گئی ہیں۔ وہ صرف دو قبیلے ہیں۔ اُن میں ایک کا تعلق سٹر بن کی اولاد میں ترین قبیلے سے ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اور دوسرے کا تعلق حضرت عثمانؓ کے بیٹے آبان کی اولاد سے ہیں۔ اور اس کا ذکر بھی تفصیلی طور پر اخوند درویزہ کے باب میں کیا گیا ہے لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ دونوں قبیلوں کی بیشتر اولاد اس مخمصے اور تذبذب سے ابھی تک نہیں نکلے ہیں کہ اُن کا تعلق کس قبیلے کے اخوند خیل سے ہے۔ خصوصاً بونیر، چملہ اور چغرزئی میں رہنے والے اخوند خیل جو کہ تاریخی، اور نسبی لحاظ سے دو مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالانکہ اپنے قبیلے کے بارے میں صحیح معلومات کرنا ایک اسلامی فریضہ ہے۔ حضورؐ کا ارشاد مبارک ہے:

ترجمہ: اپنے سلسلہ نسب کے بارے میں علم حاصل کیا کرو (مشکوٰۃ شریف)

اسی طرح اپنے قبیلے اور ذات کو چھپانا اور قصداً دوسروں سے جوڑنا بھی گناہ کبیرہ اور وبال کے ذمرے میں آتا ہے۔ سعد بن ابی وقاص سرور دو جہاںؐ سے نقل کرتے ہیں: جس نے اپنی ذات بدل دی حالانکہ اس کو علم ہے کہ یہ میری ذات نہیں ہے پس جنت اُس پر حرام ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت ہے:

''جس نے منہ موڑا اپنے باپ دادا سے پس تحقیق اُس نے کافروں کا فعل اختیار کیا یعنی ناشکری کی''۔ ایک دوسری روایت میں فلیس منا کے الفاظ آئے ہیں۔ حضور ﷺ نے حسان بن ثابت کو حکم دیا تھا کہ وہ قریش کے نسب نامے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے یاد کرلیں۔ خود حضور ﷺ نے اپنا نسب نامہ عدنان تک واضح فرمایا ہے۔ افغانی اخوند خیل کے جد امجد اخوند سالاک اور اخوند سباک ہیں۔ اور ترین سے تعلق رکھتے ہیں۔ ترین قبیلہ بہت پہلے یوسف زئی کے ساتھ ترناؤ سے منتقل ہوئے ہیں۔ مندڑ کے ساتھ اُنہیں حصہ دیا گیا ہے اور بعد میں اخوند سالاک اور بہا کو خان وغیرہ ڈوما سے لڑے تو مفتوحہ علاقوں میں افغانی اخوند خیل کو حصہ ملا اور وہ اب کلالی پورن مارتونگ کابل گرام وغیرہ میں آباد ہیں۔ اس قبیلے کا تفصیلی ذکر اخوند سالاک کے باب میں آچکا ہے۔ اس قبیلے کے برعکس عثمانیؓ اخوند خیل کے اسلاف میں اخوند سعدی نے افغانستان سے یوسف زئی کے ساتھ ہجرت کی۔ یوسف زئی کے ساتھ تیس افراد کے برابر شیخ ملی تقسیم میں اسے حصہ دیا گیا۔ آپ کا مزار گدر حمزہ خان، شہباز گڑھی رستم میں ہے۔ یہ حصہ اُسے چغرزئی کے بھائی دولت کی اولاد مندیزئی کے ساتھ ملا تھا۔ پھر اُن کے بیٹے اخوند گدا کو چغرزئی کے شاخ اسماعیل خیل میں دس افراد پر مشتمل حصہ ملا جو کہ مذکورہ دونوں شاخیں یوسف زئی کے ہیں۔ علاقہ چغرزئی میں اخوند درویزہ تولد ہوئے۔ مغل حکومت کی یوسف زئی پر جبر وظلم کی سبب اخوند درویزہ بابا نے پہلے اسلام پور سوات اور پھر پشاور ہجرت کی۔ اور یوسف زئی، چغرزئی، مندیزئی میں حصہ اراضی (یوسف زئی ویش میں ملا ہوا حصہ) پر اپنے بیٹوں میں سے کچھ کو بٹھا دیا۔ کیونکہ ہجرت میں اُن کے ساتھ شامل دو بیٹوں عبداللہ اور اخوند کریم داد کا ذکر ملتا ہے۔ حالانکہ اُن کے چھ بیٹے تھے۔ اخوند درویزہ پشاور میں دفن ہوئے۔ آپ کا ایک بیٹا اسلام پور میں رہ گیا اور دوسرا بیٹا اخوند کریم داد واپسی پر جہاد میں مشغول ہونے لگے۔ اخوند درویزہ بابا نے اپنی کتاب تذکرۃ الابرار والشرار جو کہ 1021ھ میں لکھی ہے میں ذکر کردہ الفاظ ''رانی یومنا بران استقرار دادیم'' مذکورہ فیصلہ جس میں چغرزئی کے ساتھ دس افراد جائیداد کا ذکر ہے تا حال بحال ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اخوند درویزہ بابا کی اولاد اُس وقت چغرزئی اور مندیزئی میں اپنی جائیداد پر قابض تھے۔ بعد میں ان میں سے تحصیل علم تبلیغ دین اور جہادی سلسلے میں مختلف علاقوں میں

گئے تھے اور آج تک اُن کے چھ بیٹوں عبدالباری، عبدالخالق عرف خالق داد، عبدالکریم، میاں عبداللہ، محمد یوسف اور پائندہ محمد کے مزارات بالترتیب کشمیر، ننگرہار، کانجو سوات، اسلام پور سوات اور ایران اور ضلع دیر علاقہ اسبنڑ موضع کشمیر میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ اُن کی جائیداد پر اُن کی اولاد اب بھی مقیم نظر آتے ہیں۔ اُن کے بیٹوں میں عبدالباری، محمد یوسف اور عبدالخالق جو کہ بالترتیب کشمیر سری نگر، اسلام آباد، ایران اور ننگرہار میں مستقل طور پر رہ گئے ہیں۔ عبدالکریم عرف کریم داد اور میاں عبداللہ سوات میں رہ گئے ہیں اور اُن کی اولاد وہاں مقیم ہیں البتہ اخوند پائندہ بابا اگر چہ دیر میں مدفون ہے وہاں ایک بہت بڑے علمی حلقے کے مالک تھے۔ اسو بابا، ٹیغک بابا، اینگرو بابا اور بوڈا بابا اُن کے شاگرد اور مرید تھے۔ تاہم ایک روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھ اُن کے بال بچے بھی رہائش پذیر تھے لیکن اُن کی وفات پر اُن کی کچھ اولاد مستقل طور پر وہاں رہ گئے ہیں اور کچھ بونیر میں اپنے اپنے جائیدادوں کو سنبھالنے لگے اور آہستہ آہستہ بہت بڑا قبیلہ وجود میں آ گیا۔ (واللہ اعلم)۔

آج اُن کی اولاد شل بانڈئ، امنور، ناڑہ اور انڑ میرہ وغیرہ میں آباد ہیں۔ اُن کا اگر چہ وہ پرانا تعلق اپنے خونی رشتہ داروں یعنی اخوند کریم داد اور میاں اللہ داد کی اولاد (اُن کی اولاد اسلام پور، سپل بانڈئ، مدین، کانجو، الائی اور دندنی، میرہ وغیرہ) سے نہیں ہیں البتہ ماضی قریب تک اُن کے تعلقات کے آثار اور کہانیاں ملنے کو ملتے ہیں۔ سپل بانڈئ کے اخوند خیل کا شل بانڈئ اور امنور کے سپوتوں کے ساتھ تعلق کا خصوصی ذکر ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سپل بانڈئ کے اخوند خیل کے ساتھ یہاں کے باسیوں کے کئی ازدواجی رشتے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے اخوند خیل کا تعلق دندئ اور دمیرہ کے اخوند خیل کے ساتھ ہے۔ یہ تعلق خصوصی طور پر پالتے ہیں اور ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے ہیں اور جب بونیر کے اخوند خیل سے الائی بٹگرام، دندئ میرہ وغیرہ کے اخوند خیل کا تذکرہ کیا جائے تو وہ اُنہیں اپنے ہم نسب اور ہم قبیلہ مانتے ہیں۔ شاکر بونیری سے اس بارے میں راقم نے ایک نشست میں استفسار کیا تھا تو اُس نے بڑے فخر کے ساتھ کہا کہ دندئ میرہ کے سلطانی شام اخوند خیل ہمارے نسبی ہیں۔ مزید بتاتا چلوں کہ میرہ دندئ وغیرہ کے اخوند خیل کا تعلق اخوند کریم داد کے بیٹوں اخوند میاں نور محمد اور میاں دولت بابا کی اولاد ہے۔ تفصیل کے لئے میاں ظاہر شاہ کی کتاب ''اخوند

درویزہ بابا'' اور میاں عبدالرشید کی کتاب ''تذکرہ علماء و کبار و مشائخ عظام'' ضرور دیکھیے۔ ان میں تفصیل سے شجرے موجود ہیں۔ اس طرح انڑ میرہ اخوند خیل کے بارے میں اس طرح کا موقف بیان کیا۔ ماضی میں سوات اخوند خیل کے ساتھ تعلق اور روابط کے بارے میں فیروز بابا عمر 103 سال ولد سید رسول ولد المعروف خنک آف باجکٹہ کہتے ہیں کہ ماضی میں سوات میں بہت دیہات ہمارے اخوند خیل کے تھے وہ خود یہاں آباد تھے اور اپنے سوات کے جائیداد کو قلنگ (اجارہ) پر دیا تھا۔ ایک دفعہ قلنگ کے کم ادائیگی پر بات قتل و غارت پر پہنچی نتیجے میں اجارہ دار (برخہ خور) کو قتل کر دیئے گئے اور وہی جائیداد وہی رہی کسی اخوند خیل نے اسکی فکر تک نہیں کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہاں کے اخوند خیل کو وہاں بھی حصہ ملا تھا۔

اخوند درویزہؒ جو اس قبیلے کے جد امجد ہے۔ کا یوسف زئی ملی زئی سے ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم تھا۔ شیخ ملی کے پہلے اور بعد میں ہونے والے تقسیم میں اُنکے خاندان کو باقاعدہ افراد کے حساب سے حصہ ملا اخوند درویزہؒ پر ملی زئی نوری زئی کی اُس وقت کڑپہ میں مقیم حبیب خان مشر خان خماری خیل کی بہن خان خیلہ ایئ (خان خیلہ ایئ کا مزار اپنے سسرال اخوند گدا بابا المعروف میرے بابا کے مزار کے چار دیواری سے باہر شمالاً سلارزو میرہ میں ہے) بیاہ ہوئی تھی۔

''نوری'' آبازئی اور عیسوڑی کی اپنی ماں تھی اور ''وتی'' کے بیٹوں چغرزئی اور دولت زئی کی سوتیلی ماں تھی۔ اور اُنکی اولاد نوری زئی کہلاتی ہیں۔ دولت زئی اور نوری زئی قبیلوں کی جائیدادیں دوش بدوش واقع ہیں۔ کلپانڑی میں ''منڈیزئی'' وہ قبیلہ ہے۔ جسکے ساتھ شیخ ملی تقسیم 938ء میں اخوند درویزہ بابا کے دادا شیخ سعدی کو تیس افراد کے حساب کا حصہ اراضی ملا تھا۔ کلپانڑی گاؤں کے آخری مغربی سرے پر ''پڑونے پٹے'' نامی کھیتیاں ہیں جو اخوند خیل میں حکیم زادہ اُستاد کے خاندان کی جائیداد ہیں اور یہ ماضی میں نوری زئی کی طرف سے اخوند خیل کی دادی یعنی اخوند درویزہ بابا کی بیوہ المعروف خان خیلہ ایئ کو اپنے بھائیوں کی طرف سے بطور ''پڑونے'' ایک قسم انعام اور خوشی کی عوض ملی ہے۔ جسکی داستان کچھ یوں اخوند خیل خاندان میں محفوظ چلی آ رہی ہے۔ اور جو تاریخی لحاظ سے بالکل سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

پشتونوں کی زندگی مسلسل لڑائیوں اور قبائلی چپقلشوں اور رسہ کشیوں میں گزر رہی ہے۔ وہ یا تو دشمن کے ساتھ محاذ جنگ گرم رکھتے ہیں یا پھر آپس میں معمولی معمولی باتوں کو وجہ نزاع بنا کر تلواریں میان سے نکالتے ہیں۔ اور پھر برسوں کی دشمنیاں چلتی ہیں ماضی میں یہی سرگرمیاں جسم کے نہ کٹنے والے اعضاء تصور کیے جاتے تھے۔ اسی طرح ایک دفعہ نوریزئی قبیلے کے سورماؤں نے اپنی حریف قبیلے کو ایک جنگ میں ناکارہ شکست سے دوچار کیا اور واپسی پر مترنم موسیقی اور دھوم دھام کے ساتھ خوشیاں مناتے ہوئے اپنے گاؤں آرہے تھے خان خیلہ ابئ کو بھی اپنے بھائیوں کی کامیابی و کامرانی کی خبر مل چکی تھی۔ اور وہ اپنے بھائیوں کی استقبال میں اُنکو الوداع کہنے کے لئے آج کی ''پڑونے پٹے'' نامی مقام پر بھائیوں کو خراج عقیدت پیش کرنے انتظار کر رہی تھیں۔ جب اُنکے بھائیوں کا اُن سے ملاقات ہوئی تو اس فتح و کامرانی کی خوشی میں مذکورہ پٹے اسے بطور پڑونے دے دیا۔ اور اپنے اپنے دیہات چلے گئے یہ مقام آج بھی دولت زئی اور نوری زئی کا حد فاصل مانا جاتا ہے۔ پڑونے چادر اور دوپٹہ کا مترادف ہے۔ مجاز اً پڑونے عورت کو بھی کہتے ہیں پڑونے یا کسی عورت کا دوپٹہ پشتون معاشرے میں بڑا مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی عورت کسی تنازعہ میں سفارشی بن کر چلی جائے تو مجرم کو خطا یہ کہہ کر کے بخش دی جاتی کہ ''دوپٹے کی خاطر گناہ معاف کر دیا''۔

ایک محاورہ کے مطابق ''دورندار پڑونے'' یعنی بھاوج کا دوپٹہ یعنی بھائی کی بیوہ کی عزت و ناموس کا تحفظ کرنا دیور کا فرض ہے۔ پڑونے کے نیچے آنا ''یعنی کسی عورت کے زیر سایہ پناہ لینا'' بے غیرتی اور بزدلی کی علامت ہے۔ اسی طرح بہن بیٹی کو والدین کی طرف سے پڑونے ملتی ہے۔ تاہم یہ پڑونے مختلف شکلوں میں ماضی میں دی جاتی تھیں اور اب بھی دی جاتی ہیں۔ یہ اپنے بہن بیٹی کے ساتھ ایک قسم محبت کا اظہار ہمدردی اور شفقت و تعاون کا اظہار ہوتا ہے۔ نوری زئی خماری خیل کا اپنی بہن کو یہ پڑونے دشمن پر غلبہ پانے کی خوشی میں بطور انعام و اکرام اور تحفہ دیا تھا۔

اپنے بہن بیٹی وغیرہ کو کسی بھی حالت میں تنہا رکھنے کی روادار نہیں اگر کسی خاتون کا خاوند مرجائے تو گھر کا سربراہ اسکے سر پر پڑونے ڈال کر اسے تسلی دیتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بیوہ کی ہر قسم دلجوئی اور تسلی کا خیال رکھے گا اور اسے بے پڑونی نہیں ہونے دے گی جسطرح عورت کا

چادر اسکا پردہ ہوتا ہے۔ اسی طرح خاوند کی مثال پڑونے کی ہوتی ہے۔ خاوند کے ہوتے ہوئے وہ گھر میں پردے میں رہتی ہے۔ جب اسکی خاوند وفات ہوتا ہے۔ تو وہ بے اسرے اور بے پڑونی تصور کیا جاتا ہے۔ جسکے پشتون کسی طریقے سے متحمل نہیں ہو سکتے اکثر اوقات بھائی اپنے بہن کی درماندگی اور مفلسی کو دیکھ بطور عزت و احترام اُسے کھیت یا گھر بنانے کے لئے جگہ جیسے مقامی زبان میں کنڈر کہتے ہیں بطور پڑونے دے دیتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ خماری خیل نے یہ سیری جو کہ پڑونے کے نام سے مشہور ہے اپنی بہن بیٹی کے لئے بطور پڑونے دیا تھا۔ اور آج کل یہ سیری اخوند خیل کی اولاد کی جائیداد ہے اور وہاں اُنکی آبادی ہیں۔

اخوند درویزہ بابا نے اپنے بیٹے اخوند عبدالکریم کی شادی اپنے علاقے کے بزرگ سید علی ترمزی پیر بابا کی بیٹی بی بی شاہان سے کرادی اسی طرح اخوند عبدالکریم المعروف کریم داد نے اپنے بیٹے میاں نور محمد کا رشتہ بھی پشتون قبیلے کے یاخیل خدین خیل ملاخیل کے ایک افغان عالم دین کی بیٹی سے کرادی جو ملا ابئ اور بونیر ابئ سے مشہور تھی۔ آپ نے اپنے نسب اور اپنے علاقے سے تعلق نہ ٹوٹنے کیوجہ سے یہ رشتے ناطے کئے جو حال ہی میں کسی نہ کسی شکل میں بھی برقرار ہیں۔

اخوند درویزہ بابا کی یہ اولاد اجکل شلبانڈی، باجکٹہ انگر میرہ اور ناڑہ میں آباد تھے۔ ناڑہ کے اخوند خیل 1823ء تک یہاں کافی تعداد میں آباد تھے میاں زیور شاہ آف باجکٹہ کے مطابق اخوند خیل پہلے ناڑہ میں آباد تھے یہاں سے انگر میرہ منتقل ہوئے فیروز بابا جو کہ تقریباً 103 سال کا بابا ہے کے مطابق جنگ نوشہرہ میں یہاں کے اخوند خیل نے بہت بھاری مالی اور جانی نقصان اُٹھائی تھی۔ اور یہاں سے وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس انگر میرہ منتقل ہو چکے ہیں۔ مذکورہ دونوں صاحبان کا بیان مبنی بر وقت ہے۔ اسلئے کہ جنگ نوشہرہ جو 1823ء سکھوں کے خلاف نوشہرہ میں پیر سباک کے مقام پر لڑی گئی تھی۔ اسکا نقشہ اس وقت کے مشہور شاعر ''مویزے'' نے بہت ہی دلچسپ انداز میں ایک چاربیتہ میں بیان کیا ہے جسکے چند بند یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

په زمکه ژاړی جونه ملائك دی په اسمان
یو چڑق په ناڑه پریوت اخوند خیل شو بندیوان
د مرگه پورے پلار د حضرت دین کوی ارمان
میرات ئے پالنگونه په میدان خاوری کیده
قاصد د بادشاه راغے یوسفزی اولڑزیده

میرات ئے پالنگونه په میدان شولو یوازے
ژاړی خویندے میندے کُلمے ئی کڑے اُغازے
د خاوِرو نه شوے لاندی هغه شنے پگڑئی درازے
په صفت ئے موئزے لکه فولاد اُئشیدو
قاصد د بادشاه راغے یوسفزی اولڑزیده

اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے۔ کہ انڑ میرہ کے اخوندخیل بھی گرزندہ ویش کے موقع پر ناڑہ میں کبھی رہ گئے ہیں اور جب جنگ ڈوما 1053ء کے لگ بھگ ڈوما کافروں کے خلاف لڑی گئی تو اسمیں سوات میں اخوند کریم داد اور دولت زئی اور چغرزئی بونیر کے شلبانڈئی ناڑہ اور باجکٹہ کے اخوندخیل اپنے پشتون لشکر کے شانہ بشانہ میدان میں کود پڑے اسی طرح افغانی اخوندخیل جنہیں چملہ میں منڈڑ کے ساتھ حصہ اراضی ملا تھا وہ یوسف زئی لشکر کے دوش بدوش نگری شاہ دم وغیرہ کے پہاڑوں میں سے ہوکر اخوند سالاک اور بہاکو خان کی قیادت میں ایک بڑے لشکر کے ساتھ کافروں سے برسرپیکار رہے۔ اُنکے ساتھ سواتی اور تنول لشکر بھی تھی۔ ڈوما کو اس جنگ میں بری طرح شکست ہوئی اور مفتوحہ علاقے مذکورہ قبائل نے آپس میں تقسیم کیں۔

اسی تقسیم کے نتیجے میں عثمانی اخوندخیل کا یہ قبیلہ پشتون یوسفزئی کے ساتھ منتقل ہوئی اور وہاں تقسیم اراضی میں انہیں بھی مالکانہ حقوق افراد کے حساب سے مل گئے یوسف زئی دولت زئی اور

چغرزئی نے اس قبیلے کو اپنے وجود کا عضو مان کر انہیں اپنے سے علیحدہ نہیں کیا اور آخر وقت تک یہ قبیلہ ان کے ساتھ چمٹا رہا۔ پشتون برادری کے لئے انکے مکانات شفاخانے، انکے استانے امانت گاہ علاقائی اور خاندانی تنازعات اور خانہ جنگیوں کے مواقع پر انکے موجودگی اور ظہور امن وآشتی کا پیغام ثابت ہوتا تھا۔ اور ہر اچھے بُرے میں پشتون برادری کی تسلی وتشفی اور روحانی غذا اخوندخیلی سپوت ہوا کرتے تھے یہی وجہ ہے۔ کہ شیخ ملی کے پہلی تقسیم اراضی سے لیکر آج تک اخوندخیل پشت در پشت دولت زئی اور چغرزئی یعنی ملی کے بیٹوں کے ساتھ ہی رہے۔ اور تاریخ کے صفحات میں افغانستان سے یوسف زئی کے ہجرت کے بعد یوسف زئی کے یہ سپوت یعنی دولت زئی اور چغرزئی جہاں بھی نظر آتے ہیں اُنکے ساتھ یہی اخوندخیل اور انکا ویش بھی نظر آتا ہے۔

آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ بات واضح اور مختلف تاریخی حوالوں سے ثابت ہوتی ہے۔ کہ باجکٹہ، شلبانڈئی ورانڑ میرہ کے اخوندخیل اُپس میں خونی رشتہ دار اور عثمانی خدوخیل ہیں نہ کہ افغانی خدوخیل سے اُنکا تعلق ہے۔

یہ کہ وہ اخوند درویزہ بابا کی اولاد ہے۔ جو حضرت عثمانؓ کے بیٹے حضرت آبان کی اولاد میں سے ہے۔ اور حضرت عثمانؓ کا سلسلہ نسب والد ماجد کی طرف سے چوتھی پشت پر حضرت محمد ﷺ سے جاملتا ہے اور والدہ محترمہ کی طرف سے دوسری پشت میں آپؐ سے جاملتا ہے۔ حضرت عثمانؓ کی دادی حضورؐ کی پھوپھی تھی اخوند درویزہ بابا کی اولاد ایران، ننگرہار، کشمیر اور پاکستان میں پشاور دیر سوات، بونیر اور شانگلہ میں بڑی تعداد آباد ہے۔

سوات مدین، کانجو، اسلام پور، سپل بانڈئی، اُنکے دیہات ہیں۔ ضلع شانگلہ میں الائی بتکول، دندئی اور میرہ وغیرہ میں یہی اخوندخیل بستے ہیں۔ اور بونیر میں یہ شلبانڈئی، کلپانڑئی، باجکٹہ اور چغرزئی میں انڑ میرہ میں اپنے اپنے جائیداد کے مالک ہیں انکے برعکس افغانی اخوندخیل جن کے اسلاف اخوند سالاک اور اخوند سباک ہیں۔ وہ چملہ، کابل گرام، کوریا، کدال جنگ درہ وغیرہ میں آباد ہیں۔ مذکورہ دونوں اخوندخیل دونوں الگ الگ شجرہ انساب رکھتے ہیں۔ اور اس طرح سے دونوں 2 مختلف تاریخی قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

قرآن کریم سورہ الحجرات ایت نمبر ۱۳ میں فرماتا ہے۔

ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قومیں اور قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ اللہ علم والا خبر رکھنے والا ہے۔

افغانی اخون خیل:

توغہ ایک افغان قبیلہ ہے اور اصل میں ترین ہے۔ اس کا اصل مسکن شام میں دمشق کے شمالی سرحد پر حمات نامی علاقہ ہے۔ اُن کے آباؤ اجداد میں سے ایک کا نام توغی تھا اور اُس کے نام کے نسبت سے یہ قبیلہ توغی کہلائے۔ توغی، طوغی حضرت داوٗد کے ابتدائی دور میں حمات کے امیر تھے۔ ترین قبیلے کے بارے میں روشن خان نے اپنی کتاب تذکرہ میں لکھا ہے کہ یہ افغانوں کا مشہور قبیلہ ہے۔ قرائن سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ پہلے شام کے شمالی علاقہ (تیرا) میں آباد تھے۔ وہاں سے جلاوطنی کے بعد ایران میں بسائے گئے تھے اور ایران میں ساسانیوں کے انقلاب سے مشرق کی طرف پہاڑوں میں آباد ہوئے تھے۔ مزید لکھتے ہیں کہ ایران میں نہر تیرا یا ترین کا شہر اس نام کی ایک نہر یا دریا پر آباد تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دریائے کرخہ (دریائے سوس) کی آخری حصہ کا ایک معاون تھا جو دریائے کرخہ میں اُس کے دائیں جانب سے شامل ہوا تھا۔ قیس عبدالرشید جو کہ پشتونوں کا جدی امجد اور بابا آدم تصور کیا جاتا ہے اور پشتونوں کے آج جتنے قبیلے ہیں اُن کے تین بیٹوں بیٹ، غورغشت اور سٹربن سے پھیلے ہوئے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ترین قبیلہ بھی سٹربن کے بیٹے شرجون (شرف الدین) کے پانچ بیٹوں یعنی شیرانی (شیران)، حیاٹہ (میانزا)، بڑیث (بڑیچ) اُرمڑ اور ترین میں سے ترین کی اولاد ہیں پھر ترین کے تین بیٹے ابدال، سپین اور تور ہیں۔ احمد شاہ ابدالی جسے تاریخ میں درانی بھی کہا جاتا ہے اور افغانستان میں 1747ء میں پہلا پشتون حکمران بنے تھے بھی ترین کے قبیلے میں

سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شیرانی یا شیرانی شرجون کے پانچ بیٹوں میں سے بڑا تھا لیکن شرف الدین خاندان کی ریاستی دستار باوجود یہ کہ شیرانی کا حق تھا ترین سے بہت زیادہ محبت کے باعث اُسے دے دی۔ اسی بناء پر شیرانی نے باپ اور بھائیوں سے ناراض ہو کر اپنے ماموں کاکڑ کو پیغام بھیجا اور اُس کا پیغام پہنچتے ہی کاکڑ شرجون کے گھر گیا۔ شیرانی کو معہ اُس کی والدہ و اموال اپنے وطن لے گیا اور اپنے پاس رکھ لیا اور اس کے بعد شیرانی قبیلہ تمام اچھے برے میں غورغشتیوں کے ساتھ رہے۔ تورترین اپنے خونی رشتہ داریوں یعنی درانیوں کے ملک کے شمال میں پشین میں رہتے تھے۔ جس کی مغرب میں خوواک یا شورا بک علاقہ جس میں بڑیچ قبیلہ رہتا ہے اور شمال کے جانب شال کا علاقہ ہے، تکتو نامی پہاڑی (تکتو غر) ان علاقوں کے درمیان حد فاصل ہے۔ پشین کا علاقہ تقریباً 80 میل لمبا ہے۔ تورترین کے مقابلہ میں سپین ترین تعداد میں کم ہے۔ سپین ترین چار ذیلی شاخوں میں تقسیم ہے اورٹل اور چوٹیالی کے میدانی علاقوں میں جُرا نامی وادی میں رہتے ہیں۔ روشن خان بابا لکھتے ہیں:

''ترین کے کئی خاندان یوسف زئی کے ساتھ ابتداء ہی سے آئے اور اُن کے ساتھ آباد ہوئے اور جب یوسف زئی نے ہشتنگر کا علاقہ محمد زئی کو دے دیا اور وہاں آباد ہو گئے تو یہ ترین بھی ترناؤ سے منتقل ہو کر یوسف زئی کے ساتھ آباد ہو گئے۔ جب شیخ ملی نے ملک احمد خان اور خان قرہ کی قیادت میں اراضی تقسیم کی تو اُس میں ترین بھی شامل تھے اُس وقت وہ چملہ کے مشرقی حصہ میں رہے اور اُن کے نام سے ترینان اب بھی ایک گاؤں وہاں آباد ہے جو موضع نگری کے قریب واقع ہے۔ دلہ زاک کو نکالنے کے بعد تقسیم اراضی میں اُن کو بھی منڈنڑ کے ساتھ حصہ ملا۔ اور یار حسین منتقل ہو گئے۔ چنانچہ موضع یار حسین تحصیل صوابی میں ترینان ونڈ کے نام سے ایک مقام اب بھی موجود ہے اور وہاں ان کا ایک خاندان بھی آباد ہے۔ جب یوسف زئی نے ہزارہ پر یورش کی تو ترین اُن کے ساتھ تھے اور وہاں کے میدانی علاقوں میں ڈیرے جما لئے تو اُن کے آبادیاں درویش، پانڈک، ریحانہ اور ہڈیانہ وغیرہ کے ناموں سے منظر عام پر آئے اور وہ طور ترین کہلائے۔ اس کے علاوہ جٹو، تربیلہ میں بھی اُن کی مختصر سی آبادیاں تھیں اور اب اس ڈیم کی وجہ سے دوسری جگہوں کو منتقل ہو گئے ہیں جسے سپین ترین کہتے ہیں''

حیاتی افغانی اور تواریخ خورشید جہاں جو کہ تاریخ کی معتبر کتابیں ہیں میں ترین کا جو شجرہ بیان کیا گیا ہے وہ یہاں یوں بیان کیا جاتا ہے۔ خورشید جہاں میں شیر محمد خان گنڈاپور نے قیس کے بیٹے سٹربن کے بیٹے شرف الدین کے پانچ بیٹوں میں سے ایک بیٹا ترین لکھا ہے جبکہ حیاتی افغانی میں بھی صفحہ 140 پر شرجون (شرف الدین) کے پانچ بیٹے بتائے ہیں۔ لیکن صفحہ نمبر 172 پر ترین کا علیحدہ شجرہ نسب لکھ کر اُسے شرجون (شرف الدین) کے بجائے خرسٹون (خیرالدین) کی اولاد میں لکھا ہے جو کہ پہلے مذکورہ دونوں حوالوں کی روشنی میں ٹھیک نہیں ہے۔

ترین کے تین بیٹے ابدال، تور اور سپین ہیں یعنی تور ترین اور سپین ترین ہیں۔ سپین ترین درخیل کے چار بیٹے دورخیل، سلیمان لغ طام اور ادھمی یا اوپچی ہے۔ اسی طرح تور ترین کے چار بیٹے بابو، ملمونی، کندہ زی اور سیکمی بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں پھر ملمونی کے دو بیٹے ہارون اور علی ہے۔ کندہ زئی کے پانچ بیٹے نیک ختانی، بتیزئی، منگل زئی، مندیزئی اور ثرل زئی ہیں۔ سیکمی کے دو بیٹے کوک اور باھی ہیں۔ آگے جا کر ملمونی کے بیٹے ہارون کے سات بیٹے ہیں جن کے نام یہ ہیں: یعقوب زئی، بادوزئی، نورزئی، ملک یار، اسماعیل زئی، ابوبکرزئی اور حیدرزئی ہیں۔ پھر ابوبکرزئی کے چار بیٹے احمد زئی، پیکل زئی، خان خیل اور ہدیا بیان کئے گئے ہیں۔ قبیلہ ترین تاریخ میں بہت مشہور قبیلہ ہو گزرا ہے اور اس قبیلے نے بہت سے شہسواروں اور بہادروں کو جنم دیا ہے۔ قائل قبائل یوسف زئی باکو کے دور میں اس قبیلہ کے ایک بڑے بزرگ اخون سالاک اپنے استاد اخون پنجو بابا روشن خان کے تذکرہ کے مطابق 945ھ میں بمقام چینہ ڈھیری نزد صوابی میں پیدا ہوئے جبکہ مصنف تاجک سواتی کے مطابق آپ کی پیدائش 937ھ میں ترکئی میں ہے۔ اُن کے والد غازی خان افغان شہر سنبھل (ہندوستان) میں رہتے تھے اور ابراہیم کے امراء میں شمار ہوتے تھے۔ ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد وہ اپنے علاقہ یوسف زئی میں خان گجو حکمران یوسف زئی کے ہاں آکر رہائش پذیر ہوئے اور جان خان المعروف دیوانہ بابا کی ہمشیرہ سے شادی کی۔ تاجک سواتی کے مصنف اُسے اخون درویزہ باباؒ کے مخالف لکھتے ہیں۔ اس کے برعکس میاں عبدالرشید اپنی کتاب علماء و کبار و مشائخ عظام میں اُسے اخون درویزہ باباؒ کے خلیفہ اور ماذون لکھا ہے۔ آپ کے مطابق آپ سید عبدالرحیم

کے بھائی اور دیوانہ بابا کا خالہ زاد تھے۔ روشن خان کے تذکرہ کے صفحہ نمبر 151 کے مطابق اخوند پنجو بابا کے افغان ہونے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ تذکرہ کے صفحہ نمبر 147 پر روشن بابا رقمطراز ہیں:

''واضح ہو کہ تپہ چغرزئی میں غازی خان کے اپنے خیل والے عزیزوانی بھی آباد ہیں جو کہ قریب ڈھائی ہزار گھرانے ہیں، اس کے برعکس بعض مکاتب فکر اخوند پنجو بابا کو حسینی سید ثابت کرتے ہیں۔ تاجک سواتی اور مملکت گبر کا مصنف تو اخوند پنجو بابا کے بارے میں جداگانہ رائے رکھتے ہیں، اُن کے خیال میں وہ نہ گوجر ہے نہ سید اور نہ افغان۔ بلکہ آپ نے کافی دلائل دیکر ثابت کیا ہے کہ وہ سلاطین پیچ کے نسل سے ہیں اور تاجک گبری سواتی ہے۔ واضح رہے کہ اس خاندان سے اخوند درویزہ باباؒ کی ماں عفیفہ قراری بھی تعلق رکھتی ہے تاہم ڈوما کے خلاف لشکر کشی کے لئے لشکر روانہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ بابا کے دل میں دینی جذبہ کے ساتھ ساتھ اپنے خونی رشتہ کی حمایت کا جذبہ کارفرما تھا اور یہ کہ آپ کا تعلق تاجک سواتی سے تھا۔''

اخوند پنجو بابا کی اجازت پر ڈوما کے خلاف لڑے اور موضع کابل گرام میں مستقل طور پر رہنے لگے۔ اخوند سالاک کا اصل نام اکبر شاہ تھا۔ عالمگیر نامہ میں آپ کا نام ملا چالاک درج ہے۔ آپ کا دوسرا بھائی پیر عمر المعروف اخوند سباک یا پیر سباک تھا۔ نوشہرہ میں دریائے کابل کے بائیں کنارے واقع بڑا گاؤں آپ کے نام سے منسوب ''پیر سباک'' بھی ہے۔ اخوند سباک یہاں رہ چکے ہیں۔ عالم، فاضل اور ولی اللہ تھے۔ آپ کا مزار مردان کے سدھوم میں واقع ہے۔ اُن دونوں بھائیوں کے متعلق عبدالبصیر نعمانی حنفی افغانی اپنے کتاب خزینۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں کہ وہ افغانستان کے قندھار میں ارغنداب نامی علاقہ سے دین محمدیؐ کی اشاعت اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آئے تھے۔ پروفیسر محمد اختر نے اپنی کتاب میں اخوند سباک کی تاریخ وفات 1067ھ بتائی ہے جبکہ عبدالبصیر نعمانی نے لکھا ہے کہ اخوند سباک بابا 1075ھ میں یعنی اخوند درویزہ بابا کی وفات کے قریباً 17 سال بعد کابل گرام دریائے سندھ کوہستان میں وفات پا گئے۔ سنا ہے کہ 10-2009ء میں ملاکنڈ ڈویژن میں جن مشکل حالات اور ہجرت کی تلخیوں سے گزرا اور تاریخ کا ان مٹ اور انتہائی

ناقابل یقین باب بن گیا اسی سلسلے میں اخوند سالاک کا مزار بھی بری طرح مسخ کیا گیا۔ اخوند سالاک بابا بہت متقی، صاحب سیف اور متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے صاحب قلم، ادیب و مورخ بھی تھے۔ ان کی تالیف میں فتویٰ عربیہ، بحرالانساب، غزوہ اور مناقب زیادہ مشہور تھے۔ بحرالانساب شجرہ نسب کا جامع کتاب ہے لیکن اب نایاب ہے۔ راقم کوشش بسیار اور انتہائی تگ و دو کے باوجود حاصل نہ کرسکا۔ شاید اُن کی اولاد میں سے کسی کے پاس موجودہ ہو۔ آپ کا فتاویٰ عربیہ بھی کم اہمیت کی کتاب نہیں ہے۔ حضرت اسماعیل شہید نے جب وادی پشاور میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی تو وہ اکثر شرعی فیصلے فتاویٰ عربیہ کے مطابق صادر کیا کرتے تھے۔

آپ کے شجرہ کے بارے میں پروفیسر محمد اختر اپنی کتاب تاجک سواتی و مملکت گبر میں رقمطراز ہے: آپ کا شجرہ نسب جو آپ کا خود مرتب کردہ ہے خان روشن خان نے اپنے مقالہ ''افغانوں کی نسلی تاریخ'' کے صفحہ نمبر 65 پر درج کیا ہے۔ آپ 115 پشت میں یہودیٰ بن حضرت یعقوب تک پہنچتے ہیں۔ اخوند سالاک کا شجرہ خان روشن خان نے یوں نقل کیا ہے: قیصر شاہ بن عبدالرحمٰن بن ملک آمان شاہ بن شاہ حسین بن میاں اعظم شاہ بن محمد صفا بن محمد اولیاء اخون اشرف بن اکبر شاہ معروف بہ اخوند سالاک اور اخوند سباک کا شجرہ نسب افغانوں سے ہے اور اُن دونوں کی اولاد اخوند خیل کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اخون، اخوند کا مرخم ہے۔ یہ تورانی لفظ ہے جس کے معنی قبحر عالم کے ہیں۔ لغوی اعتبار سے اخوند کے معنی سکالر، محقق اور دانشور کے ہیں۔ اور اگر دیکھا جائے تو ان میں علمی بصیرت، تحقیق اور عقل و دانش بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس لئے اُن کی بزرگی، پارسائی اور علمی دولت کی بدولت اُن کی اولاد اخوند خیل کے نام سے پہچاننے لگے اور وہ آج کل اپنی پشتون برادری اور غیر پشتون کے درمیان بڑی عزت اور احترام سے پہچانے جاتے ہیں۔ اخوند سباک کے چار بیٹے میاں بابا، شیخ بابا، پاچا بابا اور سیریٔ بابا کے ناموں سے مشہور ہیں۔ سیریٔ بابا کی اولاد سیریٔ نزد مارتونگ اور کچھ کابل گرام میں آباد ہیں۔ میاں بابا کی اولاد کابل گرام اور کچھ کولائی علاقہ پورن میں آباد ہیں۔ شیخ بابا کی اولاد دریائے سندھ پار مشرقی جانب دوڑ میرہ میں آباد ہیں۔

باچا بابا کی اولاد سیریٔ علاقہ پورن میں آباد ہے۔ اخوند سالاک کی کچھ اولاد ملک احمد خیل

کے ساتھ مرغز میں آباد ہیں۔ جو اخون خیل کے نام سے مشہور ہیں۔ اُن کے علاوہ اُن کی آبادیاں چینی (گدون)، تپہ بائی زئی کے موضع جلالہ اور موضع درہ تحصیل صوابی اور موضع جنگدرہ میں مقیم ہیں۔

اخون سباک کی اولاد موضع بڑوچ میں اور چملہ کے مواضعات چنگلئی، کوریا، کودال اور کولائی پورن میں آباد ہیں۔ اور بڑوچ سے ان کی چند گھرانے گجر گڑھی میں آباد ہو چکے ہیں۔ کوریا علاقہ چملہ میں مطہر شاہ صاحب اخون خیل راقم کا قریبی رفیق اور قرابت داروں میں سے ہیں اور محکمہ تعلیم میں مدرس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اخون سالاک بابا کی اولاد میں ولی اللہ کا بلگرامی اپنے زمانے کے بڑے عالم شیخ القرآن اور بزرگ شخصیت ہو گزرے ہیں۔ طلباء کا وسیع حلقہ رکھتے تھے اور ایک دانشور، مبلغ دین، ادیب اور مشائخ و اکابرین میں اپنی مخصوص اسلوب اور امتیازی مقام کے مالک آفاقی شخصیت تھے۔ طویل علالت اور زندان میں طویل عرصہ تک اسیری کی زندگی گزارنے کے بعد یکم محرم ۱۴۳۲ ہجری بمطابق ۸ دسمبر ۲۰۱۰ء بشب بدھ مالک حقیقی سے جا ملے اور کا بلگرام میں سپرد خاک کئے گئے۔

قبیلہ تاجک سواتی

اِس مشہور اور تاریخی قبیلے نے تاریخ کی مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے شہرت پائی ہے۔ جو کہ وقتاً فوقتاً بے شمار لوگوں کے دِلوں پر راج کر رہی ہے۔ محققین اور دانشوروں نے ہر نام کے پس منظر میں کافی معلومات کا خزانہ جمع کیا ہے۔ لیکن ایک بات تسلیم شدہ ہے کہ ان تمام ناموں سے منسوب جو تاریخی قبیلہ ہے۔ وہ ایک ہے اور وہ تین شاخوں گبری، متراوی اور ممیالی ہیں۔ جو کہ اپس میں ہم قوم اور تاجک ہیں طبقاتی اور سماجی لحاظ سے یہ دو طبقوں یعنی حکمران طبقہ جسے سلطانی کہتے ہیں۔ اور دہقان طبقہ جو کہ خود مختار مرزبان تھے میں تقسیم ہیں مواخر الزکر طبقے کا کام دشمن سے برسرِ پیکار رہنا، باج وخراج کی شرائط طے کرنا اور صلح کے عہدے نامے باندھنا تھا۔ قبیلہ تاجک کی بہتر اقتصادیات اور مظبوط سیاسی نظام کا سارا تانا بانا اُنکے سر ہوتا تھا۔ دہگان فارسی لفظ ہے جسے معرب کر کے دہقان بنایا گیا ہے۔ اور رئیس دیہ (نمردار یا مقدم) کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ساسانیوں کے نظام جاگیرداری میں دہگان کی حیثیت ابتدائی اکائی کی تھی اور وہ اپنے گاؤں کی زمینوں کا مالیہ اکٹھا کرتا تھا۔ اُس زمانے میں اُن کی مثال اور حیثیت موجودہ دور کے خوانین وڈیروں اور سردار جیسے تھی۔ جو اپنے کارندوں کے ذریعے اپنے جاگیروں کے مالیے اکٹھا کرتے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی نے جب حکومت سنبھالی اور یوسف زئی، علاقہ مہمند، خلیل، داودزئی خالصہ خٹک، ہشت نگر اور علاقہ کوہاٹ وغیرہ علاقے تمام مطیع فرمان کر لئے ملک محروسہ میں عشر مقرر کر کے اسکی ادائیگی اور وصولی کے ذمہ دار ہر ایک تپہ کے سرکردہ خوانین ٹھہرائے گئے۔ عربوں نے جب ایران پر قبضہ کیا تو ساسانیوں کے نظام مالگزاری کو نہیں چھیڑا اور دہگان کی وہی پرانی حیثیت بحال رہی۔ البتہ وقت گزرنے پر لفظ دہگان بگڑ کر دہقان بن گیا۔ اور رفتہ رفتہ اُسکی حیثیت ایک مزارع تک محدود ہو کر رہ گئی جو اب بھی قائم ہے۔ موجودہ زرعی نظام میں دہقان اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جو زمیندار اور جاگیر

دار کے زمین کو سنبھالنے کے عوض فصل میں مخصوص حصہ وصول کرتا ہے۔ لگتا ہے کہ سلطان فکیل نے جب اِس علاقے کو فتح کیا تو اپنے ساتھ وہ صدیوں پرانا نظام مالگزاری لایا۔ اُس وقت بھی دہگان کا شمار ایک جاگیردار اور اشرافیہ طبقے میں ہوتا تھا۔ آج بھی بعض دیہاتوں میں اس طبقے کے نام سے زرعی کھیتیاں منسوب پائے جاسکتے ہیں۔ بونیر کے گاؤں کالاخیلہ کے مضافاتی علاقے میں دہقانان نامی چھوٹی وادی اُس دور کی یاد تازہ کرتی ہے۔ تاریخی حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ ساسانیوں نے بھی آسوریوں اور بابلیوں سے یہ نظام اپنایا تھا۔ لفظ دہقان کی ابتداء عبرانی لفظ ''دیگان'' بتایا جاتا ہے۔

اِسی طرح لفظ تاجک پر محققین نے جو تحقیق کی ہے اُنکے رو سے یہ اصطلاح عربوں کے قدیم نام سے مشتق ہے۔ اس لئے ایرانی لوگ عربوں کے لئے تاز کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اور ہر وہ شخص جسکا تعلق عرب سے ہو اُسے تازی یا تاژک کہتے ہیں۔ جو تاجی یا تاجک کا مترادف ہے۔ لیکن بعض محققین کا خیال ہے۔ کہ تاجک چینی لفظ ''تاؤچی'' کا مترادف ہے۔ جو کشاوزوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ تاجک لفظ خالصتاً فارسی ماآخذ ہے۔ اس لئے اسکا استعمال ایرانی مقبوضات میں ہوتا ہے اور تاریخ سے ثابت ہے کہ ماضی میں فارس ایک بڑی سلطنت ہو گزر چکی ہے۔ جس میں دوسرے بہت سے علاقوں کے علاوہ بدخشان کنڑ اور بلخ کے تاجک بھی شامل تھے اور قبیلہ سواتی مذکورہ علاقوں میں سے تھا تاجک قوم کے بارے میں شیر افضل خان بریکوٹی اپنی کتاب ''مولانا اخوند درویزہؒ'' میں صفحہ 231 پر مولانا عبدالحکیم اثر افغانی کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں۔ مشہور مورخ میکھیز کے بیان کے مطابق تاجک، طایک قوم ارمین ٹائی، عرب طائیان یعنی سامی النسل ہیں جو 500 ق م میں اس خطہ میں آباد تھی۔ اور افغانستان میں دیگان اور وادی پشاور کے پرانی تاریخ میں دھقانان کے نام سے یاد کی گئی ہے۔ اس قوم کے لوگ مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں آج بھی آباد ہیں اس کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ شمالی افغانستان کی وادی کنڑ، لغمان، کوہستان، ریزہ، کوہ دامن، تگاب، بخراب، پنجشیر وغیرہ علاقوں میں اندراب اور سویت یونین کی ریاستوں میں تقریباً 21 لاکھ کی تعداد میں آباد ہے سویت روس کی ریاستوں میں ایک علاقہ تاجکستان کے نام سے اس قوم

کا موجود ہے۔ جو اشتراکی نظام کے تحت یونین میں شامل ہے۔ نسلاً سب مسلمان ہیں اور عرب النسل ہیں۔ اس قبیلے کے اولین مسکن کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ کہ بابل اور اسواد اُنکا وطن تھا۔ تاجک کا یہ مخصوص طبقہ سکندر ذوالقرنین کی نسل سے ہے۔ یہ لوگ پہلے دین زرتشت پر قائم پکے خُدا پرست تھے اُنکے اسلام قبول کرنے کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ کچھ گبریوں نے اسلام کے ابتدائی دور میں اسلام کرلیا تھا۔ مگر طبرستان، ہستیان، زابلستان۔ کے گبری حکمرانی تیسری صدی ھجری تک بدستور اپنے قدیم دین زین زرتشت پر قائم رہے اور ساسانی دور میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ساسانی بھی ایرانی النسل گبری (مغ) تھے۔ گبری کو گبری یا مغ کیوں کہتے ہیں پروفیسر محمد اختر صاحب اس پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ ترکی میں لفظ گبیر کو ''گور'' لکھا جاتا ہے۔ جو مطلق مشرک لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مگر ایران میں اسکا اطلاق زرتشتوں پر ہوتا ہے۔ اور حرف ''گ'' کے اضافے سے اسم تحقیر میں بدل کر گبرک اور ''گبرکی'' استعمال ہوتا ہے۔ گبر دراصل مغ ہے گبر، مغ آتش پرست مجوس (دین زرتشت) تھی۔ یہ لوگ مجاور آتش کدہ اور قاضی گبرال (زرتشتیاں) ہیں۔ یہ قومی دلیر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سوات کوہستان میں اُتروڑ سے آگے گبرال نامی خوبصورت وادی ہے۔ جو یہاں قدیم گبریوں کی اقامت پر دلالت کرتی ہے۔

یہ گبری، ممیالی، متراوی اور تاجک سواتی ایک ہی قبیلے کے مختلف نام ہیں اور سب کا منبع اور سرچشمہ ایک ہے۔ تواتر کے ساتھ یہ سکندر ذولقرنین (سائرس) کے نسل سے چلے آرہے ہیں۔ لیکن بعض تاریخدانوں نے اسے سکندر مقدونی کے ساتھ باندھ کر بہت بڑی اور صریح غلطی کی ہے۔ ان گبریوں کو سوادی صواتی، اور سواتی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ گبری جو بابل اور اسواد عراق بین النہرین سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمخامنشی اور ساسانی دور میں حکمران بنے اُن میں رتبیل نہم جسکا نام گبر تھا یعقوب لیث کے ہاتھوں شکست کھا کر قیدی بنائے گئے اور ذالستان سے اتابلہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

بعض دانشور اور تاریخدان لفظ سوادی یا سواتی سوات میں رہنے کی وجہ سے قبیلہ تاجک کی صفتی نام ظاہر کرتے ہیں۔ اسیطرح تاجک نسبتی اساس اور گبری اُنکی قدیم مدنیت اور زرتشتی

کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ لفظ سواتی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قبیلہ سواتی کے لوگ اپنی بُلند آواز کی سبب صواتی (سوادی) کہلاتے تھے۔ اور اُنکے یہاں آباد ہونے سے یہ ملک سواد (صوات) مشہور ہوا تاریخ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ قبیلہ تاجک کا اصل وطن عراق تھا جب عربوں نے عراق پر قبضہ رکھا اور عراق کی زرخیزی اور دجلہ وفرات کے کناروں کی چکنی مٹی والی زمین پر نظر پڑی تو عراق کا نام سوادر کھا سلطان فکہل اور سلطان بہرام کی قیادت میں جو لشکر آئی اور قبضہ جمالیا اور سوات کی زرخیزی اور سونا اگلنے والی چکنی اور سیاہ مٹی کو دیکھا تو انہیں اپنے اسلاف کی وطن اور اس نئے سرزمین میں کافی مماثلت نظر آئی شاید انہوں نے اس نئی مٹی پر اپنے اسلاف کے وطن کی محبت کا پیاس بجھانے اور اپنی تاریخی ورثے کی تقدس کی خاطر اس علاقے کو یہ نام دیا ہو۔ بیان بریں کے علاوہ لفظ سوات کے متعلق ایک تاریخی واقعہ کچھ یوں بھی ہے۔

'' سلطان فکہل کے وفات کے بعد اُنکے بیٹوں کے درمیان خانہ جنگی چھڑ گئی جس میں کافی قتل وغارت ہوا سلطان فکہل کی بیوی نے اسے اپنے لئے بدشگون قرار دیتے ہوئے اپنے بیٹوں اور مملکت سوات (جو کہ سوات بونیر وغیرہ پر مشتمل تھی) کے حق میں بددُعا کی اسے صوات یعنی ''غوغا شدہ'' کا نام دیا۔

خُدا کی شان دیکھئے شاید یہ اُس ماں کی دِل آزاری اور بددعا کا نتیجہ ہے۔ کہ اس جنت نظیر وادی کا سینہ آج تک یلغاروں سازشوں اور گولہ بارود سے خالی نہیں رہا۔ اور ہر وقت ملکی اور بین الاقوامی مفادات کی ایک لابی یہاں کے کھیت ومنڈیر اور در وبام پر ننگی تلوار کیطرح لٹکتی نظر آتی ہے۔ بحر حال وجہ تسمیہ جو بھی ہو۔ قبیلہ تاجک سواتی ایک حکمران طبقہ ہو گزرا ہے جس نے صدیوں تک ایک بہت بڑے علاقے پر بلا شرکت غیر کے حکومت کی ہے۔ اس خاندان کا پہلا حکمران سوات سلطان فکہل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ چھٹی صدی ہجری 590ھ بمطابق 1192 کے آخری عشرے میں حکمران بن بیٹھا۔ اُسکا چھوٹا بھائی سلطان بہرام تھا۔ اُن دونوں کا تعلق اصل میں حکمران پیچ جو سلطانان کے نام سے مشہور رہے ہیں سے تھا (واضح رہے کہ پیچ اور نور صوبہ کنٹر کے دو دروں کے نام ہیں اور دونوں سلطان کجامن کے بیٹے اور سلطان ہندو کے پوتے تھے۔ ان میں سے سلطان لکھل

ایک وسیع علاقے پر حکمران تھے جسمیں لغمان، کونڑ باجوڑ، سوات اور کشمیر کے علاقے شامل تھے ہزارہ کا مشہور علاقہ پکھلی ان کے نام سے منسوب ہے۔

جب دونوں بھائیوں نے اقتدار سنبھالا تو انہوں نے اپنے اپنے سلطنتوں کے حدود بڑھائے سلطان فکہل نے باجوڑ سوات اور کشمیر کا پہاڑی علاقہ فتح کیا۔ اور اُنکے نام سے دو الگ علاقے مشہور ہوئے ایک سوات بونیر اور باجوڑ ریاستوں کو ملا کر سلطان پکھل کے نام سے منسوب پکھل سرکار بنایا اور دوسرا دریائے سندھ کے مشرق میں تا بحد بارہ مولا پکھلی تھا۔ دوسری جانب سلطان بہرام نے لغمان اور ننگر ہار کو اپنے زیر قبضہ رکھا۔ مذکورہ علاقوں پر اقتدار قائم رکھنے کے بعد رفتہ رفتہ یہاں اپنے قبیلے کے لوگوں کو آباد کیا اور خود علاقہ پاپین نامی علاقے میں رہنے کو ترجیح دی۔

سلطان فکہل کے وفات پر اسکے بیٹوں کے درمیان چپقلشوں اور رسہ کشیوں نے سر اُٹھایا۔ جس کی وجہ سے مفتوحہ علاقے ہاتھ سے نکلنے کا خطرہ پیدا ہوا سلطان بہرام نے بروقت اقدام کیا اور اپنے بھائی کے مقبوضات پر لشکر کشی کر کے اپنے قبضے میں لے لیا۔ کشمیر کو فتح کرنے کے بعد اپنے ایک بیٹے کو وہاں چھوڑ کر ننگر ہار واپس ہوا تا کہ سلطان تومنا کو معہ اہل وعیال کشمیر منتقل کریں۔ مگر جونہی کوٹ ننگر ہار پہنچا قضائے الٰہی سے فوت ہوگیا۔ اور آج اُسکی کشمیری اولاد کشمیر میں ہے اور ننگر ہاری اولاد ننگر ہار میں موجود ہے۔

سلطان بہرام کے بعد اسکے بیٹے سلطان تومنا نے سلطنت سنبھالی مگر اس خاندان کی حکومت شنوار کے پہاڑوں، کنڑ، سوات اور باجوڑ، ضلع ہزارہ اور کشمیر تک محدود رہی بلکہ امیر تیمور کی اولاد کے زمانے میں کابل ننگر ہار اور پشاور کے پہاڑوں اور دشتوں کے دامنوں میں پختون قوم جو قندہار اور دریائے ارغستان کے وادی میں آباد تھے ہجرت کر کے آباد ہوگئے۔ سلطان فکہل اور سلطان بہرام نے چنگیز کے حملوں سے پہلے ہندوؤں اور بدھ مت کے پیروکاروں کو شکست دیکر مملکت گبر قائم کی تھی۔ اُس وقت ہندوشاہی حکمران ہنڈ کے پایہ تخت سے اپنی حکومت کنٹرول کرتے تھے اور ان تمام علاقہ جات پر مقامی راجاؤں کی چھوٹی چھوٹی راجدھانیاں قائم تھی۔ اور ان سب کا مرکزی مقام ہنڈ تھا۔ جسے محمود آف غزنی کے لشکر کے ہاتھوں ڈھا دیا گیا اور پہلی دفعہ یہاں باقاعدہ

طور پر اسلام کی ضیاء پاشیوں کا ظہور ہونے لگا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ۴۴ ہجری میں ابو مہلب کی سرکردگی میں اسلامی لشکر کا صوابی (چھوٹا لاہور) تک آنے کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن وہ آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا شاید اُس کی وہ آثر نہیں رہی جو محمود آف غزنی کے حملے سے پڑی۔

چنگیز نے خلج ترکوں کے تعاقب میں تین ماہ سوات ولایت گبر میں قیام کیا تھا۔ اور ترکوں کے اکثر جوانوں کو تہہ تیغ کرنے کے بعد ترکستان واپس چلا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اس وقت بھی بعض علاقے ایسے بھی تھے جو فکہل خاندان کے تسلط سے باہر تھے۔ اور ان پر ترکوں کی عرصہ دراز سے حکومت چلی آرہی تھی۔ یہ ترک غالباً حیطا النسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جنہوں نے کشن خاندان سے قبل گندہارا اور سوات اور ہزارہ وغیرہ علاقے فتح کر کے اپنے قلمرو میں شامل کر لیے تھے۔ ان ہندو ترکوں کو نہ تو سواتی سلاطین نے اور نہ ہی ترک سلاطین نے دریائے سندھ کے دونوں کناروں سے ملک بدر کر لیا تھا۔ اس وقت سے اخون سالاک کے حملے تک اُن کے مقبوضات میں حسن زئی، اکازئی، مداخیل، مخوزئی چغرزئی وغیرہ شامل تھے۔

چنگیز کے بعد تیمور کے حملے کے وقت حکمران کشمیر سلطان سکندر بت شکن نے امیر تیمور کی اطاعت قبول کر لی اسلئے سوات بونیر اور باجوڑ اسکی یلغار سے بچ گئیں اور ان پر کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس وقت بدخشاں اور ننگر ہار نے سوات اور باجوڑ سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ اسلئے امیر تیمور نے اپنے قلمرو میں شامل کر دئے جبکہ سلاطین پکھل سرکار (بونیر، سوات، باجوڑ) حسب سابقہ کشمیر کے توابع میں رہی اور سلاطین سوات بدستور آزاد حکمران رہے۔

ضلع ہزارہ کے پکھل کو امیر تیمور نے 901ھ 1399ء میں آزاد ترک ریاست کے طور پر قائم کیا تھا۔ مگر اسکا درجہ سرکار نہ تھا پکھل ہزارہ کو سرکار درجہ اکبر بادشاہ کے دور میں ملا اسی طرح سرکار پکھل اور سرکار سواد صوبہ کابل میں شامل کر لی گئی۔ صوبہ کابل کی وسعت اور انتظامی ڈھانچے پر بحث کرتے ہوئے آئین اکبری میں لکھا ہے۔ ''یہ صوبہ اقلیم سوم و چہارم میں واقع ہے کشمیر، پکلی، بنیر، سواد، باجور، قندہار، زابلستان اسی صوبے میں داخل ہیں۔ بیشتر صوبے کا پایہ تخت غزنی تھا۔ لیکن اس زمانے میں کابل اسکا صدر مقام تھا۔

اُس وقت ان علاقوں کی پوزیشن کچھ یوں تھی۔ کہ باجوڑ پر سلطان حیدر علی گبری حکمران تھے، جنوبی سوات پر حسن متراوی کی حکمرانی تھی، دیر اُوچ وغیرہ کے علاقوں میں شمس خان برسر اقتدار تھے اور سوات کے مرکزی حصے پر سلطان اویس کی حکمرانی تھی۔ سلطان اویس سلطان فکہل کا بیٹا سولہویں صدی کے شروع میں سوات کا حکمران تھا لیکن یہ سوات کا سب سے پہلا فاتح اور چھٹی صدی ہجری کے آخری عشرے کا حکمران سوات نہیں ہے۔ بلکہ یہ سلطان فکہل ثانی ہے۔ جو اپنے جدامجد اور پہلے فاتح سوات کے نام پر لکھا یا پوتے پوتیوں کے نام اپنے مشاہیر اور بزرگوں کے نام پر رکھتے ہیں۔

ان سلاطین سوات کے دور اقتدار میں یوسف زئی قبیلہ نے پہلے قندہار سے اپنے قائدین کے ساتھ کابل کوچ کیا اور پھر مغل حکمران الغ بیگ کی سفاکانہ سلوک کے بعد بچے کھچے افراد پر مشتمل قافلہ اپنے چند عمائدین کے ساتھ کابل سے وادی پشاور اسور دوآبہ میں کوچ کر گیا۔ اُس وقت دلہ زاک جو مذکورہ علاقوں کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ سے باجوڑ اور مہمند کے علاقے رہنے کیلئے مانگ لیے۔ ابھی تک یوسف زئی کسی علاقے کے قابض اور مالک نہ بن بیٹھے تھے۔ کہ کابل سے بابر نے ان علاقوں پر حملہ کر دیا۔ سلطان حیدر علی نے اُسکا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ لیکن ہتھیار نہیں ڈالا بابر کی دیرینہ خواہش تھی کہ دہلی سے ابراہیم لودھی کی حکومت کا خاتمہ کر کے ہندوستان کے تخت پر بُراجمان ہو۔ اور اس کے لئے اُس نے یوسف زئی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے بی بی مبارکہ کا رشتہ مانگا اور اِسی طرح بابر کے ساتھ اس پشتون زادی کی شادی کر دی گئی۔ بابر کے ساتھ یوسف زئی کا سینکڑوں جنگجوؤں کا قافلہ روانہ ہو کر ابراہیم لودھی پر حملہ آور ہوا ابراہیم کو شکست ہوئی اور بابر کی یہ خواب حقیقت میں بدل گئی۔

بابر کے سوات سے واپسی کے بعد یوسف زئی اور سواتی قبیلہ کے درمیان میدان کارزار لگ گیا سترہ سال تک وہ آپس میں مشت وگریباں اور نیزوں اور تلواروں کے سائے میں زندگی گزارتے گئے۔ سواتی قبیلہ بہت بڑا قبیلہ اور وسیع وعریض مملکت کا مالک تھا۔ تاہم سیاسی وحدت کی فقدان نے انہیں مختلف محاذوں پر شکست خوردہ کر کے آخر کار 1519ء میں انہیں اس وقت مکمل طور

پر بے دخل کر دیا۔ جب سلطان اویس کو اپنے دارالخلافہ منگلور سے نہاگ درہ کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا گیا اور یوسف زئی اِس علاقے کے مالک ووارث ٹھر گئے سواتی کچھ دن اپنے پُرانے علاقوں میں رہ گئے اور آپنے آپکو ان یوسف زئی لوگوں میں مدغم کر دیا اور جو مدغم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ وہ یوسف زئی سے لشکر مانگ کر ہزارہ اور سوات کے آج کے ضلع شانگلہ کے علاقوں پر دھاوا بولنے لگے جہاں انھوں نے بڑی کامیابی حاصل کی اور وہ ان علاقوں پر قابض ہو گئے جو آج بڑے مالکانہ حیثیت سے ان علاقوں میں مقیم ہیں۔ جبکہ سوات، بونیر اور باجوڑ وغیرہ میں یہ قبیلہ ایک قسم باجگزار، کاشت کار ،فقیر فقراء بیگاریاں اور خدمت گار طبقہ کا روپ دھار گیا۔ آج بھی اِن قدیم سواتیوں کی کثیر تعداد مذکورہ علاقوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن زمانے کی گردش، استحصالی نظام اور معاشرتی ناہمواریوں نے اُنکا کمر توڑ کر اُن سے اپنی تاریخ نسب اور اپنا جغرافیا یہ تک بھی بھلا دیا ہے۔ اور جو اگر اپنی تاریخ، اپنے نسب اور قبیلہ کی تاریخ کو لوگوں کے سامنے رکھنے کی کوشش کر بھی جائے اسکی باتوں کو بیہودہ اور فضول تصور کی جاتی ہے۔ اسلئے کہ معاشرے میں اسے چوپاہوں اور جانوروں کا سا رویہ اپنایا جاتا ہے ۔ حالانکہ یہی لوگ ہیں جو اِس دھرتی کے سوشل ایجنٹ ہیں۔ اور اِن کے دم اور قدم سے اللہ تعالیٰ یہ زرعی اور دیہاتی نظام قائم رکھتا ہے۔

آج کل یہ تاریخی طبقہ محض کسانوں، محنت کشوں اور بورژوائی طبقے کے طور پر پشتون برادری کے درمیان رہ رہا ہے اسکے برعکس جنہوں نے یہاں سے ہجرت کر کے ہزارہ اور ضلع شانگلہ کے بعض علاقوں میں رہ رہے ہیں۔ اُنکی وہی خاندانی شناخت اور قومی حیثیت مسلمہ چلا آرہا ہے۔ وہ آج بھی ملک کے اندر اور ملک سے باہر پوری دنیا میں اپنے اپنے قدیم نام ''سواتی'' سے پہچانے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں آپ سواتی قوم کے سپوت پائیں گے اُنکے نام کا ایک لاحقہ ''سواتی'' ضرور پائیں گے اور اُنکے ہر مکان کے دروازے پر ''نام کے ساتھ سواتی'' سائن بورڈ چسپاں نظر آئے گا۔ یہ سواتی قبیلہ جواب بھی ایک قوم کی شکل میں موجود ہے ہزارہ ڈویژن میں شنکیاری، بٹگرام، مانسہرہ، الائی، بفہ، اوگی، گڑھی حبیب اللہ اور بالاکوٹ وغیرہ میں آباد ہیں۔ اپنے آپ کو افغان اور پختون بولتے ہیں۔

بحرحال قبیلہ تاجک سواتی اِس دھرتی کے سینکڑوں سالوں پر محیط تاریخ، تہذیب وثقافت اور روایات کے امین ہیں۔ اور اِسی دھرتی کے سینے میں محفوظ اپنا قدیم اور جاندار تاریخ رکھتی ہے۔ اُنکی اپنی شناخت اور اپنا مقام ہے۔ جو اُن کو پاکستانی معاشرے میں قدم جمانے اور مہذب شہری ہونے کے حقوق کا دعویدار اور علمبردار بناتے ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ اُنکا نام اور شناخت تاریخ کی آنمٹ صداقت ہے۔

جان خان المعروف دیوانہ باباؒ

اگرچہ ملکی اور خصوصاً خیبر پختونخوا میں انتہائی نامساعد حالات کے سبب اب وہ رش اور قافلے دیکھنے کو نہیں ملتے، لیکن ماضی قریب میں جب بھی ملک میں گوشے گوشے سے موسم بہار کی آمد پر زائرین سوات و بونیر کا رخ کر لیتے، تو مذکورہ وادیوں کی قدرتی حُسن اور نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ سیاحوں کی دلی تمنا یہاں اولیاء کرام کے مذاکرات کا شرف دیدار بھی تھا جن کے لئے وہ پہلے تو سیدو شریف کا رخ کرتے اخوند عبدالغفور المعروف سیدو بابا کا زیارت کرتے وہاں سے کڑاکڑ کے پیچ وخم سڑک سے وادی بونیر میں داخل ہوتے اور حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا کے مزار پر حاضری دیتے رات گزارتے اور صبح سویرے رخت سفر باندھ کر پورے جذبے اور جوش کے ساتھ حضرت دیوانہ بابا کے مزار پر حاضر ہو جاتے اور اگر مذکورہ اولیاء کرام میں سے کسی کی زیارت کرنے سے محروم رہ جاتے تو اُنکا یہ سفر ادھورا اور نامکمل رہ جاتا لیکن انکی دینی خدمات اور کارناموں کے بارے میں بہت کم لوگوں کو علم اور معلومات ہیں۔ اور پھر تو اول الذکر بزرگوں کے جہادی کارناموں اور دینی خدمات کے بارے میں لوگ کچھ نہ کچھ تو جانتے ہونگے لیکن حضرت دیوانہ بابا کی زندگی کے اصل حقائق کے متعلق بہت ہی کم لوگ جانتے ہونگے یہی وجہ ہے کہ اس بزرگ شخصیت کے متعلق بعض لکھاری ایسے بیہودہ اور منگھڑت باتیں اوراق کی زینت بناتے ہیں اور اُنکے ساتھ ایسے افسانے گڑھتے ہیں جنکا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور اسی طرح ان کے علمی اور ادبی کارناموں پر ڈھیر مٹی ڈال دیتے ہیں۔ حضرت سید ترمذی المعروف پیر باباؒ کے مرید خاص اور حضرت اخوند درویزہؒ اور کئی دوسرے اکابرین کا رفیق خاص یہ عظیم شخصیت عوام اور خواص میں محض دیوانہ، فقیر اور مجذوب کے نام سے جانتے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ وہ ایسا مجذوب نہیں تھا جو عقل سے عاری مخبوط الحواس اور گندگی وغلاظت کے ڈھیروں پر بسیرا کرتا اور نہ ایسے لوگوں کے لئے پیر باباؒ

جیسے بزرگ کے حلقہ مریداں میں گنجائش ہوسکتا تھا بلکہ وہ ایک فقیر منش، فنافی اللہ بزرگ ادیب اور عالم وفاضل ولی تھے۔

میری مراد حضرت جان خان المعروف دیوانہ باباؒ سے ہے

''یہاں پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت دیوانہ باباؒ کو کسی اور نام سے موسوم کرنا سراسر غلط ہے ان کا اصل نام جان خان ہی ہے اور وہ قبیلہ یوسف زئی ذیلی شاخ عمر خیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

دسویں ہجری کے ان بطل حق کے اصل نام کے بارے میں محققین مختلف آرا رکھتے ہیں روشن خان باباؒ اپنی کتاب حواشی تواریخ حافظ رحمت خانی میں جان خان لکھتے ہیں جبکہ ''سادات ترمذی'' اور روحانی ترون ''سوات دتاریخ پہ رنڑا کنبے'' نامی کتب میں بالترتیب ڈاکٹر عبدالاحد شاہ اور عبدالحلیم اثر افغانی دیوانا باباؒ کا اصل نام حضرت مولانا صالح الکوزی اور ملا صالح الکوزی وشیخ محمد صالح لکھتے ہیں۔

(تواریخ خورشید جہاں جن کی تکمیل 1894ء میں ہوئی) پشتونوں کی تاریخ پر ایک جامع کتاب ہے میں حضرت دیوانہ باباؒ کا نام جان خان لکھا گیا ہے جو کہ صحیح مانا جاتا ہے کیونکہ اسکے والد کا نام عمر خان (عمر خیل) بھائیوں کے نام میاں خان اور مراد خان ہیں۔

یہ تاریخ ساز شخصیت صوابی کے علاقے میں درہ نامی مقام پر پیدا ہوئے درہ عمر خیل کی آخری سرحد ہے اور پنج پیر کے متصل واقع ہے جس گھر میں اس کی پیدائش ہوئی ہے اسکے اثار اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور درہ کے موتی خیل کے سکندر شیر کے خاندان کی ملکیت تصور کی جاتی ہے انکی بانیرئی میں مقیم اولاد کے اُنکے یہاں سے ہجرت کا عجیب واقعہ بیان کرتے ہیں جو کہ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

''وہ پیدائشی مجذوب تھے موضع درہ میں آپ کے بھائی فصل (غوخت) باجرہ کاشت کیا کرتے تھے۔ نمبروار دونوں فصل کے رکھوالے کرتے تھے جب دیوانہ باباؒ کا نمبر آ گیا تو اُس نے فصل سؤر کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا سور نے فصل کو خوب لتاڑا جس پر آپ کے بھائی نے اسکی خوب سرزنش کی

دیوانہ باباؒ نے طیش میں آ کر بھائی سے کہا کہ یہ کتنا پیداوار دیتا ہے بھائی نے اسے بیس سٹے یعنی چھ من (ایک من چالیس سیر برابر) بتادیئے دیوانہ باباؒ نے کہا کہ چلو اتنا ہی پیداوار دے گا جب اُنہوں نے تباہ شدہ فصل کو گھاس پھوس کی شکل میں جمعہ کیا تو واقعی دیوانہ باباؒ کے فرمان کے مطابق پیداوار ہوئی چونکہ یہ بزرگوں کا وطیرہ ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو اسکی بزرگانہ درجہ آشکار ہو اسی نسبت سے وہ یہاں سے ہجرت کر کے رستم میں موضع مچی چلا گیا اور وہاں ایک بوڑھے کے ہاں پناہ لی بوڑھے کی کوئی اولاد نہیں تھی اس نے اسے اپنا لے پالک بیٹا بنایا اور دیوانہ باباؒ اس کے لئے بھینسیں چرانے لگا اتفاقاً ایک دن مویشی گھر نہ آئے تو بوڑھا آدمی مویشیوں کی تلاش میں باہر چلا گیا اور ساتھ بیوی کو تاکید کی کہ دیوانہ باباؒ کو باہر نہ جانے دینا بوڑھا بیچارہ مویشیوں کی تلاش میں ایک دن اور ایک رات سرگرداں پھرتا رہا بیوی کو فکر دامن گیر ہوئی اور دیوانہ باباؒ کو ڈانٹا کہ تم گھر پر ہوں اور تمہارا منہ بولا باپ 2 دنوں سے غیر حاضر ہے جس پر دیوانہ باباؒ کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر بھینسوں کو مخصوص آواز میں (کٹیو کٹیو) پکارا آواز نکلتے ہی بھینسیں جو کہ چوروں کے نرغے میں تھیں رسیاں تڑوا کر سیدا گھر پہنچیں اس دوران بوڑھا بھی گھر واپس ہوئے بیوی کو ڈانٹا کہ میں نے آپکو تاکید کی تھی کہ اس بچے کو باہر مت جانے دینا جس پر بیوی نے کہا کہ اُس نے تو باہر قدم بھی نہیں رکھا بوڑھے نے جواب میں کہا کہ پھر مجھے ہر جھاڑے اور بوٹے سے کیسے آواز آئی کہ بابا گھر آ جاؤ بھینسیں گھر آ گئی ہیں'' یہاں پر پھر سابقہ بات سامنے آئی کہ بزرگی کا راز آشکار نہ ہو جائے دیوانہ بابا یہاں سے بونیر کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں کے ہمیشہ کے لئے ہو گئے اس طرح کے اور کئی قصے زبان زد عام ہیں لیکن جو بات زیادہ مبنی بر حقیقت معلوم ہوتی ہے اور جو عقل وفہم مانتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت دیوانہ باباؒ ایک عالم با عمل شخصیت تھے علم کی تلاش میں آپ نے بہت تگ ودو کیا ہے ریاضتیں اُٹھائیں ہیں باقاعدہ چلے کاٹے ہیں اور طویل کوششوں مجاہدانہ ریاضتوں اور دن رات کی انتھک محنتوں کے بعد روحانی فیض پایا ہے اور انہی چیزوں نے انہیں حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر باباؒ کے زانوں میں بیٹھنا اور اخون درویزہ باباؒ، ملا یوسف ابن الیاس اور مولانا تور باباؒ جیسے دینی اکابرین کا حلقہ نصیب فرمایا ہے۔

جان خان المعروف دیوانہ باباؒ کا تعلق مندڑ کے بیٹے خدر اور خدر کے بیٹے اُتمان سے ہے اُتمان کے تین بیٹے کنازی، اکازی اور سدوزی ہیں سدوزی دو شاخوں زلوزی اور دروزی میں تقسیم ہیں زلوزی کے دو بیٹے آبا اور عمر ہیں جو کہ بالترتیب آبا خیل اور عمر خیل سے مشہور ہیں عمر کے دو بیویاں مائی اور بسو ہیں آگے جا کر مائی کے تین چار بیٹے طاوس خانی، شمسہ خیل، کرم خیل اور شیر داد خیل ہیں شیر داد خیل کو اللہ تعالیٰ نے تین بیٹے میاں خان، مراد خان اور جان خان المعروف دیوانہ باباؒ دیئے ہیں۔

مائی کے تین بیٹوں کرم، شیر داد اور طاوس کی اولاد مانیری میں آباد ہیں جبکہ شمسہ خیل صوابی میں آباد ہیں انکے ساتھ شیر داد خیل بھی آباد ہیں جبکہ مجموعی طور پر عمر خیل درہ، کالا، صوابی اور مانیری بالا و پایان میں آباد ہیں جبکہ آبا خیل زیدہ، کڑے، پنج پیر، چھوٹا لاہور، شاہ منصور، کھنڈ، پنڈ میں ہیں اور دونوں کے درمیان حد فاصل پہاڑی واقع ہے سلطان احمد خیل المعروف سنامت خیل، موتی خیل، ممی خیل، اجو خیل اور مزید خیل کو مشترکہ طور پر بیسو خیل کہتے ہیں ان میں موتی خیل، ممی خیل اور سنامت خیل درہ اور مانیری پایاں میں آباد ہیں مانیری کو مرکز کی حیثیت حاصل ہے درہ کے متصل پنج پیر واقع ہے جو آبا خیل کا علاقہ ہے جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے آبا اور عمر دونوں بھائی تھے اور دنوں کی قبریں درہ اور پنج پیر کے سرحد پر ایک ساتھ واقع ہیں۔

یہاں یہ وضاحت بھی کرتا چلو کہ انگریز سرکار نے پہلا بندوبست دوسرا اور تیسرا بندوبست بالترتیب 1870ھ، 1895ھ اور 1927ھ میں کیا ہے "تواریخ خورشید جہاں جس کی تالیف پہلی بندوبست کے دوران ہوئی تھی اور 1894 تکمیل کو پہنچی تھی فارسی مسودہ میں صفحہ 189 پر عمر خیل کی اولاد میں جو جہاں خان لکھا ہے وہ دیوانہ بابا ہی ہے اسکے بھائی میاں خان کا مزار آدخان گاؤں جو اصل میں میاں خان ہے جو کہ شیر درہ میں ہے اور میاں خان کے بیٹوں مامون اور ہارون کی قبریں صوابی کے مقبرے میں ہیں اور جوڑا باباؒ کے نام سے مشہور ہیں۔

1870ء میں جب انگریز سرکار کا پہلا بندوبست ہوا تو اس وقت یہ علاقہ ضلع پشاور میں

شامل تھا شجرہ نسب میں اور بندوبست میں باقاعدہ ایک خانے میں پنی اور دوسرے میں قوم و گوت لکھا ہے علاوہ ازیں 1895 اور 1927 کے بندوبست میں بھی یہ شجرہ درج ہے۔

محمد یونس کاکا جسکا تعلق عمر خیل کی اولاد میں مئی خیل سے ہے اپنے شجرے کو ثابت کرنے اور اپنے آپکو دیوانہ باباؒ کا وارث ثابت کرنے بونیر میں واقع دیوانہ باباؒ کی ماضی کی جاگیر حاصل کرنے کے لئے وہاں کے لوگوں اور مجاوروں کے ساتھ طویل قانونی جدوجہد لڑی اور مختلف عدالتوں میں اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے گئے اور آخر کار وہ کامیاب ہوئے اور اسے دیوانہ باباؒ کا وارث قرار دیا گیا۔ اور اپنے اس مقصد کو منطقی انجام کو پہنچایا نتیجے میں اسے سینکڑوں کنال زمین ملی اور اس پر انہوں نے حکومت کو کئی سال مالیہ بھی ادا کیا لیکن علاقہ کی دوری، خاندانی چپقلشوں اور سب سے بڑھ کر عمائدین علاقہ (فقیر بابا طوطائی، عجب خان بابا اور مصطفیٰ بابا غور غشتو) پر مشتمل جرگے کی لاج رکھتے ہوئے اتنی بڑی جاگیر سے دستبرداری کا اعلان کر کے واپس کر دی۔

یونس کاکا کا شجرہ بمطابق بندوبست 1870، 1895 اور 1927 موضع مانیری پایاں ٹل شیر داد کندی مئی خیل درجہ ذیل ہے۔

شیر داد بابا کے دو بیٹے مراد خان اور حباب (جو کہ اصل ہی میں میاں خان ہے) میاں خان کا بیٹا مامون، مامون کا بیٹا لعلو، لعلو کا بیٹا محمد عرب اور محمد عرب کا بیٹا زنون اور زنون کے تین بیٹے شاہوالی، حسن اور سید خان ہیں شاہوالی خان کے تین بیٹے میر، پیر خان اور کرم ہیں پیر خان کا بیٹا آزاد خان ہے آزاد خان کی تین بیویاں ہیں زوجہ اول سے نواس خان اور نوشاد ہیں زوجہ دوم سے شاس اور مالک شاہ ہیں اور زوجہ سوم سے حبیب شاہ اور ظاہر شاہ ہیں نواز خان کے بھی تین بیٹے محمد یمین، محمد شفیع اور محمد یونس کاکا ہیں آگے جا کر محمد یمین کی اولاد محمد ادریس، محمد تسکین اور انور شاہ ہیں محمد شفیع لاولد ہے اور یونس کاکا کی دو بیویاں ہیں پہلی بیوی سے دو بیٹے فقیر شاہ اور مفرق شاہ ہیں جبکہ زوجہ دوم سے تین بیٹے محمد عارف، شاہد نواز اور آصف نواز ہیں۔ زنون کے تین بیٹوں میں سید خان نے بمطابق بندوبست 1870ء چار تورئی زمین ماشی خان جو کہ مانیرئی پایاں کا رہنے والا کرم خیل ہے پر فروخت کی ہے اور

خود ہندوستان گیا ہے اُس وقت محمد شاہ کی حکومت تھی اور اسکی اولاد ہندوستان میں ہے بندوبست مذکورہ میں سید خان کا بیٹا عمر لکھا ہے اور اسکے ساتھ یہ وضاحت کی ہے کہ وہ خود زندہ ہے اور ہندوستان میں ہے شاہد اُس وقت پشاور اور دوسرے بڑے شہروں کو ہندوستان کے نام سے پکارا جاتا ہوگا۔

(تاریخی حقائق پر جب نظر ڈالتے ہیں تو ریاستیں دیر، چترال، بونیر، سوات، باجوڑ وغیرہ پر برطانیہ سرکار کی حکومت نہیں تھی بلکہ یہ آزاد اور خودمختار ریاستیں تھیں اور صوابی اور اس کے گردنواح پر ریاست سوات سے سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے آپس کے حلقہ اثر میں رہ چکے ہیں اسلئے مذکورہ ریاستوں ان کے سرحد کے قریب رہنے والے باشندے اپنے علاقوں سے باہر قدم رکھتے تو انہیں ہندوستان کے نام سے پکارتے ہونگے۔

جب میری پہلی کتاب بونیر خدوخیل کے نام سے 2008ء میں منظر عام پر آئی تو اس پر مختلف مکاتب فکر اور دانش وروں کی آرا سامنے آئی ایک دن پشاور سے ایک موصوف نے موبائل پر رابطہ کیا تو معلوم ہوا کے وہ ایک معزز اور تاریخی اور علمی وادبی کے خاندان کے چشم و چراغ کا فون تھا جو بہت ہی تاریخی اور علمی ذوق کے ساتھ ساتھ اپنے شجرہ نسب کے جنون کی حد تک متلاشی تھا موصوف کا خاندان آخونزادگان کے نام سے خیبر پختونخوا اور اُس کے پار نہایت عزت واحترام سے جانا جاتا ہے اور ان کا اسم گرامی آخونزادہ مظفر علی ہے۔

غیر اس کی اشتیاق اور محبت دیکھ کر دو تین بار پھر بھی موبائل پر رابطہ ہوا اور آخونزادہ صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ان سے ملوں آخر کار میں آخونزادہ صاحب سے ان کے آستانہ عالیہ پر حاضری دی آپ نے اپنا مدعا تفصیلاً بیان کیا جب میں نے آخونزادہ صاحب کی اسناب پر مشتمل ایک ضخیم لائبریری اور آپ کی والہانہ لگن اور محنت کا اندازہ لگایا اور آپ نے دوران گفتگو یہ بھی انکشاف کیا کہ وہ حضرت دیوانہ باباؒ بونیر کی نسل سے ہے۔

چونکہ دیوانہ باباؒ پر کچھ لکھنے کیلئے میں پہلے بھی متفکر تھا تب سے میری تحقیقی جستجو میں بجلی جیسی تیزی آئی پہلی ملاقات میں آخونزادہ صاحب سے رخصت لے کر اور گاؤں پہنچتے ہی اپنے بھتیجے

اکرام اللہ ولد جمریز کالاخیلہ کے ایک روم میٹ آصف آف تولاندی کے ذریعے مانیری پایان میں حضرت یونس کاکاؒ کے پاس گیا اور آخونزادہ صاحب سے لی گئی معلومات کی روشنی میں تفصیلی انٹرویو کیا ان کے پاس محفوظ کردہ اہم دستاویزات کے ساتھ اُن کا بیان بھی لیا اور تمام معلومات کو ایک تحریری شکل میں ساتھ لیکر واپسی کی کچھ دنوں بعد آخونزادہ صاحب سے دوبارہ ملاقات کی اس وقت میرے ساتھ شیخ القرآن مولانا (نعمت اللہ صاحب جو کہ راقم کے اُستاد) تھے چونکہ موصوف کے پاس کافی حد تک اپنا شجرہ موجود تھا لیکن خاندان اور قبیلے سے جدائی نے سید خان کے بعد اس خاندانی بندھن میں شگاف ڈالا تھا اور تسلسل ٹوٹ چکا تھا جب میں نے یونس کاکا سے ملاقات اور پھر اس سے حاصل کردہ شجرے کے بارے میں آخونزادہ مظفر صاحب کو بتایا تو اُس نے اپنا شجرہ بھی نکالا اور جب ہم دونوں بیٹھ گئے اور میری ڈائری میں درج شدہ شجرے سے آخونزادہ صاحب کے خاندانی شجرے کو ٹیلی کیا تو سید خان تک مماثلت پائی گئی ہماری تحقیق اور آخونزادہ مظفر علی کی تاریخی تڑپ بفضل تعالیٰ بارآور ثابت ہوئی اور یوں مظفر علی کا خاندان جو ماضی میں اپنے آبائی علاقے صوابی مانیری سے اپنی جائیداد ماشی خان کرم خیل پر فروخت کرنے کے بعد پشاور کا رخ کرنے گئے تھے اور ہمیشہ کے لئے یہاں کے ہو گئے آج کل پشاور کے معروف خاندانوں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے اس خاندان نے بہت سے ادبی، مذہبی اور شہرہ آفاق شخصیات کو جنم دیا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ آخون پنجو باباؒ جو کہ ماضی میں بہت بڑے ولی اور بزرگ رہے ہے پر دیوانہ باباؒ کی خالہ شادی شدہ تھی ماضی میں آپ نے بھی صوابی ترکئی سے ہجرت کر کے پشاور مقیم ہو گئے تھے شاید اسی مذکورہ خاندان نے یہاں آخر آخوند پنجو کے ہاں پہلے پڑاؤ کیا اور پھر پشاور شہر آباد ہو گئے اور آخونزادگان پایا اور یہ نام آخر میں ان کی پہچان بن گیا اور میری تحقیق کے مطابق آخونزادہ مظفر علی کے آباؤ اجداد کے ساتھ آخونزادہ کا اضافہ آخون پنجو کے حوالے سے ہے۔

ان کا شجرہ مندرجہ ذیل ہے۔

آخونزادہ مظفر علی بن آخونزادہ قمر علی بن آخونزادہ محمد اکبر خان بن آخون ضیاء الدین بن

عمر بن سعید خان بن زنون بن محمد عرف (سلطان عرب) بن لعلو بن مامون بن میاں خان بن عمر خیل (جو دیوانہ باباؒ کے بھائی تھے)۔اخوندزادہ قمر علی کے سات بیٹے اخوندزادہ ممتاز علی مرحوم، اخوندزادہ مختیار علی نیر، اخوندزادہ امتیاز علی، اخوندزادہ اقبال علی، اخوندزادہ خورشید علی، اخوندزادہ مظفر علی اور اخوندزادہ انور علی شہید ہیں۔

میں حیران تھا کہ 1870 کے بندوبست میں جو شخصیت سید خان کا بیٹا عمر اپنی جائیداد بیچ کر ہندوستان گیا تھا اُس کی اولاد کہاں ہے اس لئے میں تحقیق میں لگا رہا اور میں آج انتہائی خوش ہو کہ بفضل تعالیٰ تاریخ کے ایک گوشے سے میں نے پردہ اُٹھایا اور دیوانہ باباؒ کو اُن کی اولاد سے اور اولاد کو اپنے جدِ امجد سے ملایا۔

دیوانہ باباؒ ایک عالم فاضل شخصیت کے حلقہ اثر اُس وقت کے حالات اور مختلف داستانوں جن کو لوگوں نے مختلف رنگوں میں پیش کئے ہیں جنکا اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے اور تاریخی حقائق اور محققین کی تحقیقی فن پاروں سے یہ بات واضح ثبوت کو پہنچی ہے کہ حضرت دیوانہ باباؒ ایک عالم، فاضل اور اپنے زمانے کے ایک مجتہد اور بلند پایہ جج تھے عبدالحلیم اثر افغانی جو کہ بہت بڑے محقق اور مصنف تھے، نے لکھا ہے کہ وہ قندہار میں قاضی کے عہدے پر متمکن تھے سادات ترمذی نامی کتاب میں مصنف، موصوف، دیوانہ باباؒ کی علمی ذوق اور پاکبازی و پارسائی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ وہ ایک جید عالم اور فقیہہ تھے آپ قندہار میں حکومت وقت کے محکمہ قضا میں قاضی القضاء تھے علم کے ساتھ روحانی فیض حاصل کرنے کی غرض سے وہ گھر سے نکلے اور متشرع پیر کی تلاش میں در بدر کی خاک چھاننے لگے آخر کار بونیر پہنچے اور حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر باباؒ کی خدمت میں ان سے فیض حاصل کیا اور تارک الدنیا ہو گئے (تو کیا ایسی ہستی ڈوما کافر کی مہیا کردہ انڈوں کی عوض دین کا سودا کر سکتا ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ انڈوں کا شوقین تھا اور ڈوما اسے انڈے مہیا کر کے اسی طرح اپنے بچ بچاؤ کرتے تھے) اور دن رات درود وظائف اور چلہ کشی میں معروف ہو گئے عمر کے آخری حصے میں آپ پر مجذوبانہ کیفیت غالب رہی اسلئے شاید آپ کا نام دیوانہ پڑ گیا۔

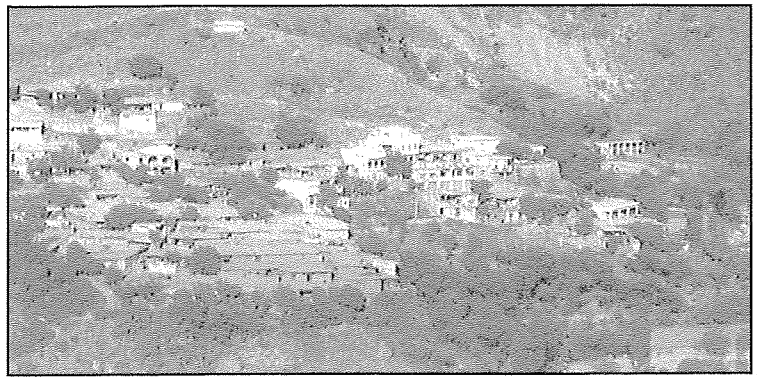

کوٹ چغرزی

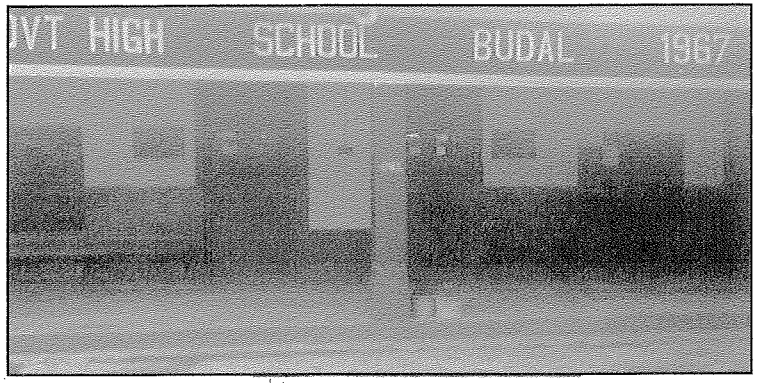

بدال جو چغرزی کا گیٹ وے اور ریاست سوات کا تعلیمی ورثہ ہے۔

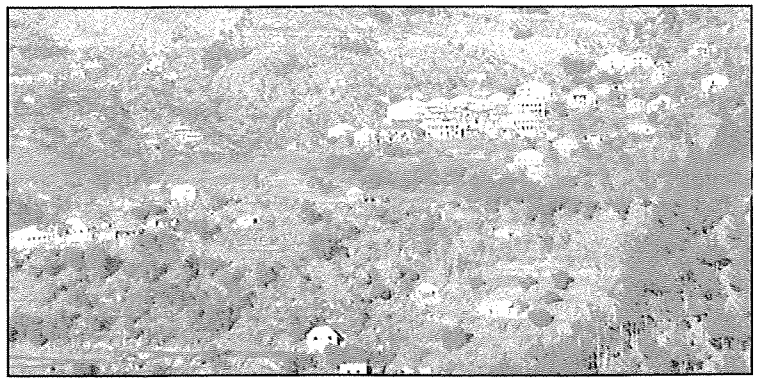

وادی چغرزی کا خوبصورت گاؤں (باسے)

ڈوماکی تاریخی چوٹی

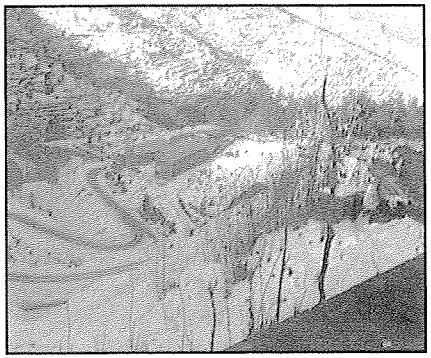

وادی چغرزی کا برف پوش منظر

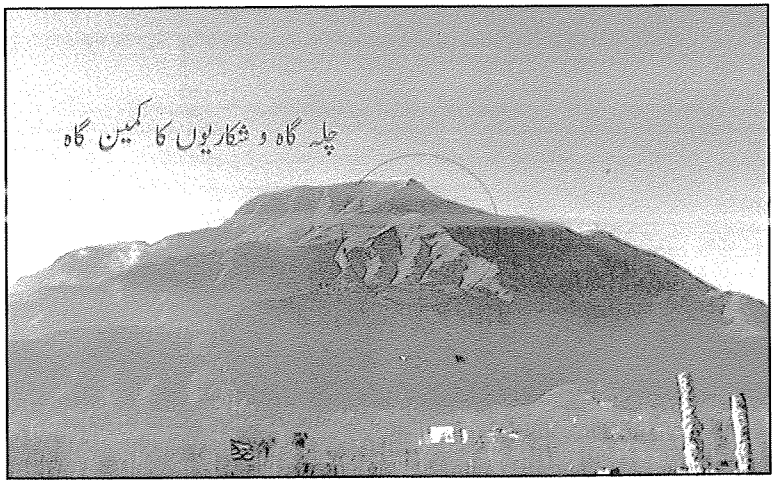

جعفر پہاڑی جہاں اخوند درویزہ بابا کا چلہ گاہ اور دامن کوہ میں اسکا جنم بھومی سالارزو میرہ بستی واقع ہے

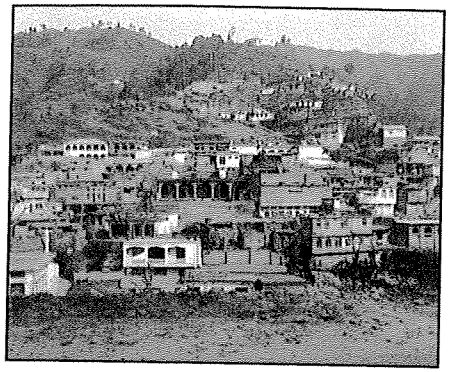

گاؤں ٹانگوڑہ کا رومانوی منظر

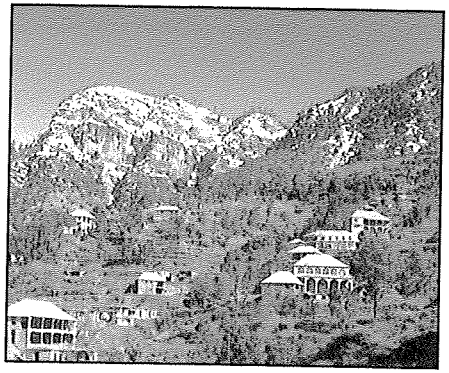

گاؤں میتنو کوہے، کی برف پوش وادی

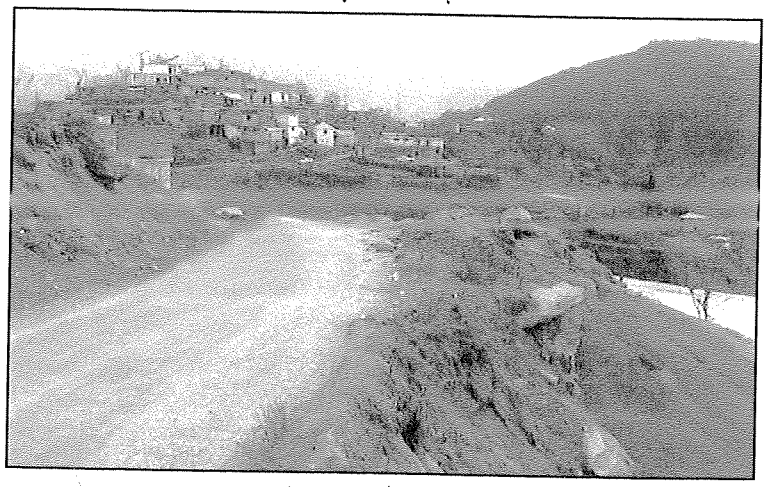

چغرزی کا مشہور گاؤں لوپٹی

مقامی فنون لطیفہ کے کتبے، جن میں ثقافتی اور مذہبی رنگوں کا حسین امتزاج نمایاں ہے۔

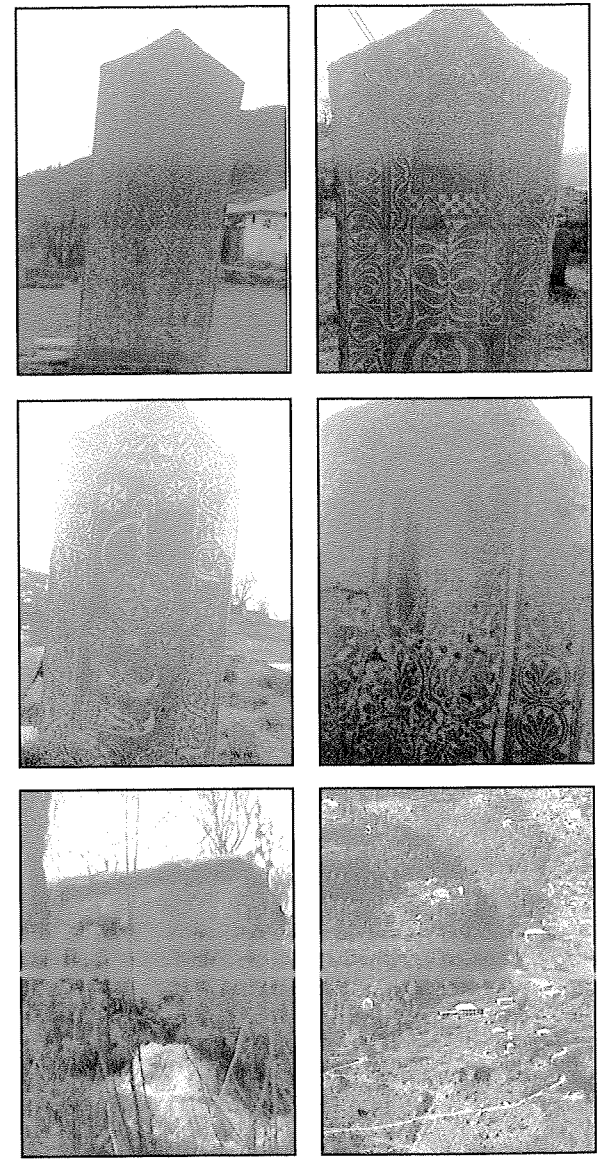

سنگرہ کا دلکش نظارہ

مقامی پن چکی

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جان خان المعروف دیوانہ باباؒ نے بہاکو خان کی لشکر میں باقاعدہ طور پر ڈوما کے خلاف لڑائی میں ایک عظیم مجاہد کی حیثیت سے حصہ لیا ہے اور بعد میں مقبوضہ علاقہ جات کی تقسیم میں اسے اسکے خدمات کی عوض حصہ ملا ہے چونکہ آپ نے دین حق کی اشاعت اور علم کی تلاش میں غرق ہوکر شادی نہیں کی تھی اور نہ دنیاوی مال ومتاع سے سروکار رکھتے تھے اسلئے اُنکے حصے میں آئی ہوئی جائیداد شاہد علاقے کے لوگوں کو فی سبیل اللہ دی گئی ہوں علاوہ ازیں عالم با عمل ہونے کے ساتھ ساتھ آپ نے قلم کا حق بھی ادا کیا اور ایک بہترین مصنف کے طور پر اپنے آپکو منوایا ہے عبدالحلیم اثر افغانی اپنی " کتاب سوات 5 تاریخ 8 رنڑا" میں اخوند سالاک کی کتاب الغزویہ کے ساتھ ساتھ دیوانہ باباؒ کے "مقامات" نامی ایک کتاب کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ سوات کوہستانی علاقوں کو اسلام کی روشنی پہنچانے کی تکمیل کا کام 900ھ تا 1050ھ انجام پایا ہے

تاریخی حوالوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت دیوانہ باباؒ اور اُن کے ہم عصروں میں ہمیشہ کفار کے خلاف اسلام کی جنگ لڑی شاہد اسی وجہ سے تاریخ میں حضرت دیوانہ باباؒ کا حصہ بہت کم ملتا ہے کیونکہ اُس زمانے میں جو تاریخ لکھی جاتی تھی وہ حکمرانوں کی مرضی سے ہوتی تھی اور حضرت دیوانہ بابا اور اُس کے ہم عصر حکمرانوں کے خلاف جہاد میں مصروف رہتے۔

قلم وتلوار کے اس مجاہد اور بطل حق کے پیدائش وفات کے صحیح تاریخ کے بارے میں تاریخ کے اوراق ابھی تک سیاہ نہیں ہوئے ہیں البتہ اُس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ پیر باباؒ جو کہ 908ھ تا 991ھ بقیدِ حیات تھے کے مرید اور ہم عصر تھے اسلئے دیوانہ باباؒ نے دسویں ہجری کی بہاریں اور خزائیں دیکھی ہیں۔ بونیر کے مرکزی بازار سواڑی سے شرقاً ایک سڑک جاتی ہے جو کلپانی سے گزرتی ہوئی دیوانہ بابا بازار میں داخل ہوتی ہے بازار کے آخری کونے پر بائیں جانب ایک نالے کو عبور کر کے اس عظیم شخصیت کا آخری آرام گاہ ہے

پشتو کا مشہور مقولہ

ہے۔

خدائے نہ کئے نو دیوانہ بابا بہ سہ کہ

''تپہ جاتی اور اراضی ویش''

چغرزئی ضلع بونیر کا شمال مشرقی وادی ہے۔اسکی سرحدات دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ 2001 کے بلدیاتی نظام کے انتخابی حلقہ بندی کے تحت یہ چار یونین کونسلوں پر مشتمل ہے جو یونین کونسل بٹاڑہ، پاندھیڑ، سورے اور گلبانڈی سے یاد کئے جاتے ہیں بٹاڑہ یونین کونسل میں مشہور دیہات بدال، شیرعلی، شمنال، بٹاڑہ، بنج کڑہ اور گلونو باوڑئ ہیں۔ یونین کونسل پاندھیڑ کے بلدیاتی حلقے میں شانگڑہ گھوڑی دار، دنگ کوھے، منزرو کوھے، چلندری، بائرو، راجکند، تیڑہ، کوز پاندھیڑ، بر پاندھیڑ، کوٹ، کس، کوزہ تالہ، برہ تالہ خرہ وا اور کاج بن مشہور اور قابل دید دیہات اور چھوٹی بستیاں ہیں۔

گلبانڈئ یونین کونسل علاقہ چغرزئی میں آبادی اور پٹوار حلقہ کی وسعت کے لحاظ سے تیسری نمبر پر ہے۔اس میں رامزے، بامے، گنبت، عالمی بانڈہ، غازی بانڈہ، پختنو میرہ، گانشال، میاں گانوں گانشال، چڑونہ، سرنگ، ٹانگوڑہ اور گلبانڈئ شامل ہیں۔

زرخیز اور شاداب فصلیں پیدا کرنے کے حوالے سے سورے یونین کونسل کا اپنا مقام ہے یہ علاقہ چغرزئی کا مشرقی حصہ ہے اسکی سرحدات ضلع شانگلہ سے ملی ہوئی ہیں۔اسکے پانی کا سارا منبع اپنی خوڑ میں گر کر آخر میں دریائے سندھ کے گود میں سر رکھ دیتا ہے۔زمینی وسعت اور افرادی قوت کے لحاظ سے یہ اس وادی کا سب سے چھوٹا اور محدود یونین کونسل ہے۔سورے یونین کونسل فیروزے کے نام سے بھی معروف ہے۔جو یہاں کے سپوتوں کے اسلاف میں سے ایک کا نام ہے۔فیروزے میں شامل دیہاتوں میں ٹوپئ، انڑ میرہ کوز تیراج، بر تیراج، چمو، بازار کوٹ آوانے، گیشاڑ، مرادو، میخونچہ، فولادی، میرہ گئ، بیخانئ، برڈب، کوز ڈب، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔چھوٹی بستیوں اور بانڈہ جات میں سورے یونین کونسل میں منی خیل، قمبرے، کوٹ حیئی (سینڑی) مرغئ، جالہ، لنڈئ، باکار، غونڈ، گڑہ، کنڈرگے، شلتالو، بوچکے اور شین کانڑے قابل دید ہیں۔

وادی چغرزئی اور تپہ چغرزئی بہت وسیع رقبہ اور افرادی قوت رکھتی ہے۔شاید اتنا بڑا تپہ یوسف زئی میں کہیں ملے اسلئے تو اسکے سپوت، کالا ڈھاکہ، ضلع شانگلہ اور ضلع بونیر تینوں اضلاع میں بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ضلع بونیر میں اُنکے علاقائی حدود حسن زئی کالا ڈھاکہ کے ساتھ بانگیڑے نامی مقام کے راستے ملتی ہیں۔ضلع شانگلہ میں بہلول خیل اور نصرت خیل چغرزئی قبیلے کے دو بڑے یونین کونسلز ہیں۔

بہلول خیل کی آبادیاں پیشلوڑ، تیت والان، ڈانکول، ڈوڈبئ اور پیشکنڈ ہیں۔جبکہ نصرت خیل کی ذیلی شاخیں بھائی خان خیل، انجو خیل، بابا خیل اور قتلان خیل ہیں۔جو کہ دیدل، کماچ، مھابن، دیول، خراؤ اور جوڑق وغیرہ میں رہائش پذیر ہیں۔

چغر بن ملی کی اولاد کئی تپہ جات اور ذیلی شاخوں میں تقسیم ہے۔اسکا بڑا تپہ بسی خیل ہے۔ اور کالا ڈھاکہ میں رہتا ہے۔بسی خیل کی ذیلی شاخیں وادت خیل، قلندر خیل، ایوب خیل وغیرہ ہیں۔

چغر بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔اور رب کریم نے اسے بہت سے اولاد سے نوازا تھا۔

ماضی میں وادی چغرزئی ہر قسم پھلوں سے لبریز علاقہ تھا۔پھل، سبزیاں اور جنگلات وافر مقدار میں ہوا کرتی تھی۔شہد، اخروٹ اور دوسرے خشک میوہ جات کی بہتات یہاں کی نمایاں خصوصیات میں سے تھیں۔اسکے مقابلے میں میدانی علاقہ بے آب و گیاہ اور خشک تھا۔اسلئے اُس وقت کی مناسبت سے ایک بہترین اور اقتصادی لحاظ سے مالدار حصص میں اسکا شمار ہوتا تھا۔آج بھی قدرت کی فیاضیوں اور بناوٹ سے پاک حسن اور لطافت کی یہاں کمی نہیں۔البتہ جدید سہولیات سے محروم علاقہ ضرور ہے وادی چغرزئی پانچ تپہ جات پر مشتمل پشتونوں کے رہائشی مساکن اور ملکیت اراضی پر مشتمل ہے۔اُن کے ساتھ سادات اور اخون خیل کی بہت بڑی آبادی رہتی ہے۔اور اپنے ملکیتی اراضی اور مساکن کے مالک چلے آرہے ہیں یہ پانچ تپہ جات جو درجہ ذیل ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔

جونا خیل، مکی خیل، شخالہ خیل، مدی خیل اور اسماعیل خیل ہیں۔واضح رہے کہ اسماعیل خیل کو فیروزے سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔فیروزے خاندانی لحاظ سے آپس میں دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ٹوپی کے اسماعیل خیل کو سُرخ (سرہ) اسماعیل خیل کہتے ہیں جبکہ بیخانئ، میرہ گئ، فولادئ اور منی

خیل، اسماعیل "ساڑہ اسماعیل خیل" کے نام سے مشہور چلے آرہے ہیں فیروزے کے بڑے دیہات میرہ گئی، فولادئی اور ٹوپئی ہیں۔ اُنکے ساتھ انخر میرہ کوز تیراج اور ڈبونہ ستھانہ داروں کے مساکن ہیں۔ ان میں اسماعیل پشتونوں کی کل جائیداد 80 سڑی ہیں۔ جن میں ٹوپئی کے 40 بیخانئی کے 10 میرہ گئی کے 20 اور فولادئی 10 سڑوں پر مشتمل ہے۔ جبکہ 40 سڑی انخر میرہ، ڈبونہ اور کوز تیراج کی ہیں۔ فیروزے کے ساتھ اداخیل نامی ایک پشتون قبیلہ رہتا ہے جو دو بڑے شاخوں خواجہ قدر اور سید کور میں تقسیم ہیں خواجہ قدر کے سپوت مراد و آدانے اور کوٹ میں بستے ہیں۔ اور سید کور میخوچہ اور گیشاڑ میں آباد ہیں۔ مذکورہ دونوں خاندانوں کی جائیدادیں "سڑوں" کے حساب سے بالترتیب 12,13,16 اور 26 اور 13 سڑوں پر مشتمل ہے۔ میخوچہ میں اکثریتی آبادی ملیان کی ہیں۔ جو اپنے اپنے جائیداد کے مالک ہیں۔

مدی خیل

مدی خیل کی اولاد گنبت، گل بانڈئی میرہ، گانشال، چڑونہ، برتیراج، بازارکوٹ اور چمو میں رہتے ہیں۔ ڈاک سرمد تخیل اور گوکند کے درمیان مشترکہ پہاڑی ہے۔ مدتخیل پانچ پکے حجروں کھنڈرو حجرہ، برہ حجرہ، کوزہ حجرہ اور قونچ حجرہ پر مشتمل ہیں۔ اور اُن میں اسکی ذیلی شاخیں پائینده خیل، باباخیل، آصف خیل، عمرخیل، غریب خیل، شاہ جان خیل اور دیوان خیل رہتے ہیں۔

مدتخیل کے پانچ پکے حجرے ایک سو پچاس سڑی جائیداد پر مشتمل ہے۔ گنبت کے تین حجرے کھنڈرو، کوز لورے اور بر لورے کہلاتے ہیں۔ اور انکی بالترتیب جائیداد 50 اور 25,25 سڑی ہیں۔ چوتھا حجرہ بازارکوٹ ہے۔ اور 25 سڑوں پر مشتمل ہے۔ اور پانچواں حجرہ برتیراج اور چمو ہیں۔ جو کہ بازارکوٹ کے برابر 25 سڑوں پر مشتمل ہیں۔ واضح رہے کہ چمو اور بازار کوٹ کے دو سڑی جائیداد گنبت برلوری میں رہ گیا ہے کھنڈرو حجرہ میں پائینده خیل آباد ہیں۔ کوز لورے آصف خیل اور باباکورکا ہے۔ اور برلوری میں اکثریتی آبادی پائینده خیل اور غریبانان کی ہیں واضح رہے کہ شخالہ خیل میں ٹانگوڑہ برلورے اور باے نسب کے لحاظ سے ہم نسب اور خونی رشتہ دار ہیں اور مدتخیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

مکی خیل

رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا رقبہ مکی خیل کا ہے۔ اس میں شانگڑہ چلندری، گھوڑی دار، دنگ کوھے، بابا میرہ، بائیرو، پاندھیڑ، کوٹ پاندھیڑ، برہ تھیڑہ، کوزہ تھیڑہ، کس، مشہور اور تاریخی مقام ڈوما، راج کند، بھیم پور، شاھی، شیرعلی، بانگیڑے، سروگلوجبہ اور خونہ میرہ کے علاقے شامل ہیں مکی خیل کی ساری جائیداد مقامی بولی میں اتہ شلے یعنی 160 سڑیہ کہلاتی ہے۔ اسے دو برابر حصوں میں کوز اتیا اور براتیا میں تقسیم ہے۔ تقسیم میں جغرافیائی نشیب وفراز کا خیال کھا گیا ہے۔ جو علاقے نشیب میں واقع ہیں۔ اُنہیں کوز اتیا کا نام دیا گیا ہے۔ اور جو اونچائی میں واقع ہیں اُنہیں براتیا سے یاد کیے گئے ہیں۔ مکی خیل میں پاندھیڑ کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اسکی مرکزی حیثیت کی وجہ سے اسے یونین کونسل کا اعزاز حاصل ہے۔ کوز اتیا میں بائرو، پاندھیڑ، کوٹ، تھیڑہ، ڈوما، کس، فیزہ، شوکاڑ، مُلا سر اور بانگیڑے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اور براتیا میں شانگڑہ، بابافیزہ، راج کند، دنگ کوھے، منزرو کوھے، گھوڑی دار، بھیم پور، شاھی، اجلئی اور چلندری وغیرہ شمار کیے جاتے ہیں۔

بابافیزہ، شانگڑہ اور بھیم پور برہ تھیڑ، پاندھیڑ اور بائرو میں مکی خیل کی ذیلی شاخیں خدتخیل اور سید خیل رہتے ہیں دنگ کوھے منزرو کوھے اور بانگیڑے میں میاں گان رہتے ہیں۔ اسی طرح کوزہ تھیڑہ میں آزاد خیل کوٹ میں سید خیل آزاد خیل، پاندھیڑ میں خدتخیل اور ملیان اور جبو میں سید خیل بستے ہیں مکی خیل کی ذیلی شاخیں آزاد خیل، سید خیل، جابر خیل، حسام خیل، خدی خیل اور فراز خیل ہیں۔ آزاد خیل تھیڑہ بھیم پور اور کوٹ میں آباد ہیں۔ سید خیل کوٹ، کس اور شانگڑہ میں رہتے ہیں۔ کس میں جابر خیل بھی رہتے ہیں۔ حسام خیل کے مساکن چلندری اور کس ہیں۔ خدی خیل بائرو، برہ تھیڑہ اور کس میں مقیم ہیں۔ نیو پاندھیڑ میں فراز خیل بستے ہیں۔

شخالہ خیل

شخالہ خیل پانچ تپہ جات میں سے ایک ہے۔ اسکا مرکزی گاؤں اور اسکے سپوتوں کے

اکھٹے رہنے اور جرگہ کانفرنس ٹانگوڑہ ہے یہ انکے لئے تجارتی منڈی بھی ہے۔شخالہ خیل بنیادی طور پر تین پکے حجروں ٹانگوڑہ، کوزہ حجرہ، ٹانگوڑہ برہ حجرہ اور بنج کڑہ حجرہ پر مشتمل ہے۔ٹانگوڑہ برہ حجرہ کے ساتھ مرزا سر، رمزے، کونکوال اور موطا خان درہ شامل ہیں۔ٹانگوڑہ کوزہ حجرہ میں عالمی بانڈہ زُنبقے، بامے اور سنگری شامل ہیں۔اسی طرح برہ حجرہ میں غازی بانڈہ، برہ بانڈہ اور میخو کوھے کو بانڈہ جات کی حیثیت حاصل ہیں۔کوزہ حجرہ کے بانڈہ جات میں کوٹ، بگڑیا، اٹوگئی، بنڑہ بابا ،ڈمبرہ اور ڈیران وغیرہ شمار کیے جاتے ہیں۔بنج کڑہ حجرہ کے ملحقہ علاقہ جات بلندئی میرہ، خوڑگئی اور کوزہ کڑہ ہیں۔اور اُنکے بانڈہ جات میں قونج وغیرہ شامل ہیں۔بانڈہ جات میں اجڑ گوجر اور پشتون آبادیاں ہیں۔شخالہ خیل میں سادات آبادیاں غازی، بانڈہ بنڑ بابا، بگڑیا اور میخو کوھے اور عالمی بانڈہ میں آشکالی کے مقام پر دس بارہ گھرانے بستے ہیں۔

تپہ شخالہ خیل کی کل جائیداد 120 سڑوں پر مشتمل ہے۔اور ہر حجرہ 40,40 برابر سڑوں پر مشتمل ہے۔سڑی جائیداد کا حساب پہاڑی اور نیم پہاڑی علاقوں میں الگ الگ طرز کا پیمانہ اراضی رکھتا ہے۔بعض مقامات پر ایک سڑے دو جریب کے برابر ہوتا ہے۔تو بعض جگہ یہی سڑے پانچ جریب کا پیمانہ بھی رکھتا ہے۔شخالہ خیل کی ذیلی شاخیں صوبہ خیل، آزاد خیل، مراد خان کور اور زین خیل ہیں۔

جونا خیل

تپہ جونا خیل بڑی آبادی اور وسیع مضافاتی علاقہ رکھنے والا تپہ ہے۔اسکی سرحدات دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔یہ ایک طرف جنوب کی جانب خاتانوں ڈیرئی سے ملتی ہیں۔تو دوسری طرف دولت زئی کے لخت جگروں کے گاؤں مٹوانی سے اسکی سرحد لگتی ہے۔جنوب مشرقی جانب دور تک علاقہ غیر کالاڈھاکہ سے گلے ملاتا ہے۔مشرق کی جانب مکی خیل، شخالہ خیل کے بنج کڑہ ٹانگوڑہ، پاندھیڑ اور تیڑہ وغیرہ سے ملتا ہے۔اور مغرب کی طرف خئی درہ، بونئی، امنور پلواڑے وغیرہ سے اسکی سرحدات ملی ہوئی ہیں جونا خیل چھ پکے حجروں گھڑی حجرہ، گلونو باوڑئی حجرہ، میخ حجرہ، برہ حجرہ بنڑہ، کوز شمنال اور برشمنال حجرہ ہیں۔سڑوں کی حساب سے انکی کل جائیداد 132 سڑی بنتی ہے۔جو

حجروں کے مابین تھوڑے اتار و چڑھاؤ کے ساتھ منقسم ہیں۔

جنکی روشنی میں گلونو باوڑئی (2) گھڑی حجرہ بنڑہ (2) برہ حجرہ بنڑہ (2) اور کوشمنال اور برشمنال (2) برابر حصوں 24,24 سڑوں کی حساب سے جائیداد رکھتے ہیں۔سڑوں کی یہ حساب زمین کی زرخیزی، بانجھ پن اور جغرافیائی خدوخال کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہے۔متذکرہ حساب سے "سڑے" کی قیمت گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے۔

"سڑے" بڑی اکائی ہے۔ایک "سڑے" جائیداد 36 پیسے جائیداد پر مشتمل ہے۔نیم "سڑے" بارہ پیسے کے برابر ہوتا ہے۔اور بارہ پیسے جائیداد کو مقامی لوگ تیراؤ کہتے ہیں۔تیراؤ سے چھوٹی اکائی "پاؤ" کہلاتی ہے۔جو 9 پیسے پر مشتمل ہوتا ہے۔جونا خیل کا زمینی نقشہ میدانی بونیر جیسا ہے۔کیونکہ دریائے برندو اسکے ساتھ ایک ہی سطح پر ملتا ہے۔پوری وادی میں جونا خیل کی جائیداد کا حساب پکا اور مربوط مانا جاتا ہے۔اور باقی تپہ جات کی تین "سڑی" جائیداد جونا خیل کے ایک "سڑی" کے برابر تصور کیا جاتا ہے۔"سڑی" کا یہ پیمائش اکائی اصل میں روپئی ہے۔روپئی علاقہ یوسف زئی میں جہاں بھی ہے۔چالیس پیسوں کے برابر ہوتا ہے۔لیکن بعض علاقوں میں اسمیں علاقائی رسم ورواج اور لوگوں کے مزاج کے مطابق تبدیلی لائی گئی ہے۔اور روپئی 40,30,28 اور 64 پیسوں کے برابر مانا جاتا ہے۔یہی روپئی بعض علاقوں میں پچہ، سٹہ، برخہ، قولبہ، خروار اور سڑے بھی کہا جاتا ہے۔اسکی چھوٹی اکائی پیسہ ہے روپئی کے نصف حصے کو نیمہ کئی اور بعض مقامات پر ادیلئی کہا جاتا ہے۔بعض علاقوں میں زمینی ویش کو روپئی اور "سڑے" کے برعکس دوسرے پیمانے سے کیا جاتا ہے۔جسے مقامی زبان میں موٹی کہتے ہیں۔موٹی کے ساتھ ساتھ "سڑی" کا حساب بھی چلتا ہے۔زمینی ویش میں پہاڑی اور میدانی علاقوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔میدانی ویش ایک سڑے تقریباً تین جریب کے برابر ہوتا ہے۔اسکے ساتھ پہاڑی حصہ بھی اسی نسبت سے دی جاتی ہے۔پہاڑی حصہ کی تقسیم بھی مختلف صورتوں میں وقوع پزیر ہوتا ہے۔جو کہ عموماً تین بڑے حصوں جنگل، گھاس کا حصہ اور سادین (وہ زمین کا ٹکڑہ جسمیں مکئی، لوبیا، کارا اور نسک کاشت کی جاتی ہے) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

کارا: سرسوں جیسے دانے رکھتے ہیں۔ اسکا رنگ سفید ہوتا ہے۔ اسکے دانے چاول کیطرح پکائے جاتے ہیں ماضی میں کھارایا کارا اکثر پرندے کھایا کرتی تھی۔ زمیندار انہیں گوپن کے ذریعے بھگاتے تھے۔ اور گوپن مارتے وقت ایک خاص اواز ''اوووان'' کے ساتھ کچھ اس قسم کی گیت شروع کرتے تھے۔

داز لے نا کام دے بیابہ نہ کرو کارا

اوراس طرح پرندے اُڑ جاتے تھے۔

جونا خیل کے بڑے دیہات بدال، ریال گلونو باوڑئ، بٹاڑہ، کوز شمنال اور برشمنال ہیں اُنکے علاوہ قاردرہ، اُڑک، تمباکو، سقلہ، الہ گرام، سرکلے، بیلگا، تالہ وغیرہ قریہ نما بستاں ہیں اور جونا خیل کی دو بڑی ذیلی شاخیں عثمان خیل اور بابا خیل ہیں۔ عثمان خیل کی ذیلی شاخیں عثمان خیل، لنگر خیل اور دوڑی خیل ہیں جبکہ بابا خیل کی ذیلی شاخیں زمان خیل، کرم خیل، گوجر خیل اور سُندر خیل ہیں سُندر خیل جبو، بانگیڈے اور کوز بستیاں شمنال میں آباد ہیں چغر بن ملی کی شاخیں جونا خیل، مدی خیل، اسماعیل خیل، شخالہ خیل اور مکی خیل ضلع بونیر میں آباد ہیں۔ بہلول خیل ضلع شانگلہ میں آباد ہیں۔ اور بسی خیل اور نصرت خیل ضلع شانگلہ میں سینگری، آتیشت اور ضلع مانسہرہ میں کالا ڈھاکہ میں آباد ہیں۔ اُنکے درمیان دریائے سندھ بہہ رہا ہے۔ ان میں بسی خیل سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ جسکی ذیلی شاخیں ایوب خیل، ناصر خیل، باری قدم خیل، قلندر خیل اور شوخیل ہیں۔ اور انکی مساکن جودہ باہ، شنگردار، شاہ تل، ریڑ بنڑ، کوٹکے، موسیٰ خیلو سر، شگئی اور شاہ ڈاگ وغیرہ میں ہیں۔ نصرت خیل کی ذیلی شاخوں میں بھائی خان خیل، بابا خیل، انجو خیل اور قتلان خیل شامل ہیں اور انکے مساکن دیدل، کماچ، مھابن خراؤ، دیول اور جوڑق وغیرہ میں ہیں۔

سورے یونین کونسل

سورے یونین کونسل بنیادی طور پر ایک زرخیز اور آباد علاقہ ہے۔ 1998 کی مردم شماری کے تحت اسکی کل آبادی 15294 ہے۔ قبیلوی لحاظ سے یہ چار حصّوں میں منقسم ہے۔ غالب اکثریت اسماعیل خیل قبیلے کی ہے۔ اسماعیل دو بڑے حصوں کوز اور براسماعیل خیل میں منقسم ہیں اور یہ تقسیم اُنکے سپوتوں میں جغرافیائی نشیب وفراز کی روشنی میں کی گئی ہے۔ جہاں اسماعیل بابا کے بیٹے بلندی پر رہتے ہیں، اُسے براسماعیل خیل اور جہاں نشیبی علاقوں میں بستے ہیں۔ کوز اسماعیل خیل کا نام دیا ہے۔ براسماعیل خیل میں ٹوپئ اور اس سے ملحقہ بانڈہ جاتی مضافات شامل ہیں جبکہ کوز اسماعیل کے بڑے اور مرکزی دیہات بیخائئ، فولادئ اور میرہ گئی ہیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے بانڈہ جات اور ملحقہ جات رکھتے ہیں۔ کوز اور براسماعیل کی کل جائیداد 120 سڑوں پر مشتمل ہے اور دونوں میں مساوی طور پر تقسیم ہے۔ دوسرا پشتون تپہ اداخیل کا ہے۔ گیشاڑ، مرادو، آوانے میخوخپہ اور کوٹ میں اداخیل قبیلہ کے لوگ رہتے ہیں۔ مذکورہ دیہات کی کل جائیداد چالیس سڑی ہیں۔ کوڑ، مرادو اور آوانے کا مشترکہ نام خواجہ قدر ہے۔ میخوخپہ گیشاڑ کو مجموعی طور پر سید کور کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ میخوخپہ میں ملان کے نام سے بڑا قبیلہ رہتا ہے۔ تیسرے حصے کو قونج کہا جاتا ہے۔ قونج بر تیراج، چمو، بازار کوٹ اور رسول بانڈہ کا مشترکہ نام ہے۔ قونج کی جائیداد اور اکثریتی آبادی مدتخیل کی ہے۔ چمو، رسول بانڈہ اور بر تیراج کی کل جائیداد 12 سڑی کے برابر ہے اور اسکی مساوی یعنی بارہ سڑی بازار کوٹ کی ملکیتی اراضی ہے۔ تپہ جاتی تقسیم میں یہ مدتخیل کی ملکیت ہے۔ ستھانہ دار انخر میرہ، کوز ڈب، برڈب، سوقر، قنبرے، مچے اور کوز تیراج میں رہائش پزیر ہیں اور اُنکے دیہاتوں میں اُنکی اکثریتی آبادی رہائش پذیر ہے اور مالکانہ حقوق کے مالک ہیں۔

سورے یونین کی بیشتر آبادی دومنزلہ اور ٹین کی ہے جو موسمی لحاظ سے اُنکی گرمی اور سردی